فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	″
قومیت	....
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دیگئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

صدیق احمد

جلد ۸۹۔ ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۲ء، عدد ۴

مضامین

مقالات

شذرات

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنی وزارت کے زمانے میں ایک مجلس انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز (ثقافتی تعلقات کی ہندوستانی مجلس) کے نام سے قائم کی تھی، شروع میں اس کا مقصد مشرق وسطیٰ سے دوستانہ ثقافتی تعلقات پیدا کرنا تھا، اس لیے اس کا آغاز عربی میں ایک رسالہ ثقافۃ الہند کے اجراء سے کیا گیا، پھر رفتہ رفتہ اس کا دائرۂ عمل بڑھتا گیا اور اب یہ مختلف ملکوں سے ثقافتی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

مولانا آزاد کی رحلت کے بعد اس مجلس کے صدر جناب ہمایوں کبیر صاحب وزیر سائنسی تحقیقات و ثقافتی امور حکومت ہند ہیں، جو اپنی غیر معمولی لیاقت، صلاحیت اور ذہانت سے اس کے کاموں کو بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں، اور اسکے ذریعہ بیرونی ممالک میں ہندستان کے وقار کو بڑھانے میں کوشاں ہیں، اس مجلس کی طرف سے ہر سال آزاد میموریل لکچرز بھی ہوتے ہیں، اور کسی ممتاز شخص کو کسی خاص موضوع پر تین دن تک تقریریں کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں پہلے سال پنڈت جواہر لال نہرو نے "آج اور کل کے ہندوستان" پر لکچر دیئے، دوسرے سال مشہور مورخ لارڈ ٹوائن بی کو "متحدہ دنیا اور ہندستان" پر بولنے کی دعوت دی گئی، تیسرے سال انگلستان کے سابق وزیر اعظم لارڈ ایٹلی نے "اقوام متحدہ اور جمہوریت کے مستقبل" پر تقریر کی، اس سال ہندوستان کے مشہور سائنس داں سی، وی، رمن کو مدعو کیا گیا، ان کا موضوع "انسانی لیاقت کے دروازے" تھا، لکچروں کا یہ

سلسلہ بہت مقبول ہے اور ٹکٹ کے ذریعہ داخلہ کے باوجود ان کو سننے کے لیے بڑا مجمع ہوتا ہے۔

اس مجلس کی طرف سے مولانا آزاد کے تمام مضامین اور تصنیفات کو جمع کر کے ان کو اڈٹ کرنے کا کام بھی جاری ہے، جس کو مولانا مرحوم کے سابق پرائیویٹ سکریٹری پروفیسر محمد اجمل خاں بڑی خوبی اور محنت سے انجام دے رہے ہیں، وہ مولانا مرحوم کے نہ صرف مزاج شناس تھے بلکہ ان کے علم و ادب کے اداشناس بھی ہیں، اور خود بھی بہت اچھا علمی اور ادبی ذوق رکھتے ہیں، اس لیے وہ اس کام کے لیے نہایت موزوں اور مناسب ہیں۔

اس مجلس کی ایک جنرل اسمبلی بھی ہے، جس کے سالانہ جلسہ میں ملک کے اہم تعلیمی، علمی اور ثقافتی اداروں کے نمائندے جمع ہوتے ہیں، دارالمصنفین کی نمائندگی راقم کرتا ہے، اس سال اس موقع پر اس کے ایرانی شعبہ میں انگریزی میں "امیر خسرو کی تصانیف میں جذبہ حب الوطنی" کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھنے کے لیے بھی مدعو کیا گیا تھا، اس کی صدارت پنڈت سندر لال نے کی، امیر خسرو کے کلام اور تصانیف حب وطن کے جذبہ سے معمور ہیں، انھوں نے ہندوستان کی ہر چیز خصوصاً یہاں کے مرغزاروں، پھلوں، پھولوں، عورتوں، موسیقی، علوم و فنون اور اخلاق و روحانیت وغیرہ کی بڑی تعریف کی ہے، اسلیے یہ مقالہ بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنا گیا، اور سامعین اس محب وطن کی رواداری، فراخ دلی اور وسیع المشربی سے بہت متاثر ہوئے، ڈاکٹر تارا چند نے اس مقالہ سے خاص طور پر دلچسپی لی، یہ مقالہ رسالہ انڈو ایرانکا میں بھی شائع ہوگا۔

اسی سفر میں "ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی پڑھنے کا موقع ملا، جو شیخ الجامعہ جناب محمد مجیب صاحب اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی ناظم شعبۂ دینیات کی دعوت پر لکھا گیا تھا، اور محترم جناب ڈاکٹر عابد حسین کی صدارت میں پڑھا گیا، حاضرین میں جامعہ ملیہ کے اساتذہ کے علاوہ شہر کے بہت سے اہل علم اور عمائد تھے، یہ مقالہ بہت طویل تھا، اس لیے صرف خاص خاص حصے پڑھے جا سکے، پھر بھی اس سے پوری دلچسپی لی گئی، مقالہ ختم ہونے کے بعد سوال و جواب کے سلسلہ میں ایک اچھا علمی مذاکرہ ہو گیا، آخر میں ڈاکٹر عابد حسین کی تقریر سے نہ صرف حاضرین محظوظ ہوئے بلکہ مقالہ نگار بھی ان کا شکر گذار ہوا، جامعہ کی روایت کے مطابق اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی اور جناب عبداللطیف اعظمی اڈیٹر جامعہ بہت نمایاں رہے، اس تقریب سے اندازہ ہوا کہ جامعہ ملیہ کا ہر فرد دارالمصنفین کو بہت عزیز رکھتا ہے۔

اس سفر میں جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر حکومت ہند سے بھی ملنے کا موقع ملا، موصوف نے دارالمصنفین کے کاموں کی تفصیل معلوم کر کے اس سے بڑی دلچسپی لی، اور بڑے اخلاص سے فرمایا کہ اس اہم ادارہ کو برقرار رکھنے کے لیے ہر قسم کی کوشش ہونی چاہیے اور اس کام میں عملی مدد دینے اور اس کے وسائل پر غور کرنے کے لیے جون میں دارالمصنفین آنے کا وعدہ فرمایا ہے، کارکنان دارالمصنفین ان کے اس اخلاص کے شکر گذار ہیں۔

مقالات

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

(یہ مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں پڑھا گیا)

ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت کی نوعیت

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے دور حکومت میں عام مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور روحانی طاقتوں کی نشو و نما سلاطین، علماء اور صوفیۂ کرام کے ذریعہ سے ہوئی، اگر عربوں اور غزنویوں کے عہد حکومت سے قطع نظر کر لی جائے تو ہندوستان کے باضابطہ مسلمان فرمانرواؤں کا عہد تیرہویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر انیسویں صدی کے وسط میں ختم ہوتا ہے، اس ساڑھے چھ سو برس میں تقریباً ۹۰ بادشاہ ہوئے، ان میں بعض تو یقیناً رند، بدمست اور بوالہوس تھے، جو اسلام کا نام لیکر حکومت کرتے رہے، مگر ان کی سیرت کسی لحاظ سے بھی اسلامی نہیں تھی، لیکن انہی حکمرانوں میں بعض خدا ترس بلکہ زاہد و عابد بھی گذرے، بعض ایسے فاتح بھی تھے جن کی شجاعت اور زور آزمائی پر خود فن سپہ گری کو ناز ہو سکتا ہے، بعض علوم و فنون کے ایسے سرپرست ہوئے کہ ان کی قدردانی سے علم و ادب

تعمیرات اور فنون لطیفہ کو بڑا فروغ ہوا بعض کی کوششوں سے تہذیب و تمدن میں ایسے جلوے اور نئے رنگ پیدا ہوئے کہ ان سے آج تک ہندوستانی زندگی معمور ہے۔ ان حکمرانوں کا سب سے بڑا اور عمومی صفت یہ تھا کہ وہ عدل پرور اور انصاف پسند رہے، اور برے سے برا حکمراں بھی یہ پسند نہ کرتا تھا کہ عوام اس کی عدل پروری اور انصاف پسندی سے بدظن ہوں،

اسلام کا نعرہ

ممکن ہے درۂ خیبر اور درۂ گومل سے آنے والوں کا اندرونی مقصد محض فتح و تسخیر اور حصول دولت ہی رہا ہو لیکن وہ اسلام کا نعرہ بلند کرتے ہوئے آئے، اور گو انھوں نے اسلامی اور دینی حکومتیں قائم کرنے کے بجائے اپنی قبائلی اور خاندانی سلطنتیں بنائیں لیکن ان ہی کی وجہ سے یہاں علما، صلحا، اور مشائخ کو قدم جمانے کا موقع ملا، اور گو ان کے درباروں کی فضا اسلامی نہیں رہی لیکن ان ہی کے سہارے اس سرزمین میں اسلام پھل پھول سکا، اور گو انھوں نے تبلیغ اسلام کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن ان ہی کی بدولت مبلغین اسلام کی کوششیں بارآور ہوئیں، اور مسلمانوں کی آبادی بڑھتی گئی۔

یہ عجیب بات ہے کہ اچھے اور برے دونوں حکمرانوں نے جو کچھ کیا اسلام ہی کا نام لیکر کیا، وہ اسلامی تعلیمات کے خلاف جانشینی کے لیے جنگ کرتے لیکن جب تخت پر بیٹھتے تو اسلامی روایات کے مطابق امرا سے بیعت لیتے اور دین مبین کے حامی بننے کے لیے اس کے مناسب کوئی لقب اختیار کرنا ضروری سمجھتے، اسی لیے کوئی دین کا قطب، کوئی شمس، کوئی رکن، کوئی غیاث، کوئی جلال، کوئی نور اور کوئی شہاب بنجاتا، مورخین بھی ان میں سے کسی کو کہف الاسلام والمسلمین، کسی کو رکن الاسلام والمسلمین، کسی کو ظہیر الامت، کسی کو راعی شرائط شریعت محمدی اور کسی کو غمخوار دین وغیرہ کے لقب سے یاد کرتے، اور ان میں بعض فرمانروا ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی بادشاہت اور حکومت کی مذہبی توثیق کے لیے خلفائے بغداد سے سندیں بھی حاصل کیں اور اپنے نام کے ساتھ یمین الخلافت

ناصر امیر المومنین اور نائب امیر المومنین لکھتے۔ گو ان کی نجی زندگی خالص اسلامی نہیں رہی، پھر بھی شاید ہی کوئی ایسا حکمراں گذرا ہو جس نے کسی شیخ وقت کے سایۂ عاطفت میں پناہ نہ لی ہو، یا ان سے فیوض و برکات حاصل نہ کیے ہوں، علما، تو ان کے دربار کا ضروری جز بن گئے تھے، سلاطین دہلی کے دور میں شیخ الاسلام، قاضی القضاۃ اور صدر جہاں اور مفتی متدین علما ہی مقرر کیے جاتے، اسی طرح عہد مغلیہ میں صدر الصدور، قاضی اور قاضی القضاۃ کے عہدے علما ہی کو دیے جاتے،

حمیت اسلامی کا لحاظ

یہ فرمانروا اگرچہ پوری طرح اوامر و نواہی کے تو پابند نہیں ہوتے تھے لیکن ان کی کوشش ہوتی کہ ان کے عہد میں معروف کو قائم کرتے اور منکر کو مٹاتے رہیں، اور احکام شرعی کی خلاف ورزی کے احتساب میں کوئی کوتاہی نہ کریں، ان میں سے بڑے سے بڑا دیندار حکمراں حضرت عمر بن عبد العزیز کے نمونہ کی بھی حکومت قائم نہ کر سکا لیکن برے سے برے حکمراں کو بھی اپنی خود نمائی اور خود پرستی کے باوجود غیرت اسلامی کا خیال ضرور رہا اور جہاں حمیت اسلام کا سوال پیدا ہوتا وہاں ان کا مذہبی جوش ضرور ابھر آتا، یہ جب فاتح بن کر امرا، کے جلو میں ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ حجازی، ساسانی، ترکستانی، تاتاری اور ایرانی روایات بھی لائے، اور ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی ماحول سے بھی متاثر ہوئے۔ اور ان کی معاشرتی، تمدنی اور تہذیبی زندگی میں مختلف عناصر کی آمیزش رہی جس پر ان فرمانرواؤں کی شعوری اور غیر شعوری کوششوں سے اسلامی رنگ کی ایسی چھاپ پڑی کہ وہ غلط یا صحیح اسلامی معاشرت و تہذیب کہلانے لگی، اور اس کو فروغ دینے میں ہر ممکن کوشش کی گئی، محلوں خصوصاً مقبروں کے بنانے میں جو اسراف کیا جاتا تھا، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے کبھی جائز نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن اس کو بناتے وقت نہ صرف حکمراں، بلکہ معمار بھی محسوس کرتے کہ وہ اسلامی فن تعمیر کو فروغ دیکر اسلام کی شوکت میں اضافہ کر رہے ہیں، اور آج تاج محل کو دینی نقطۂ نظر سے کتنا ہی بدعت

اور اسراف تصور کیا جائے لیکن بڑے سے بڑا متقی اور متقشف عالم بھی اس کے اندر پہنچکر یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس نادرۂ روزگار عمارت کے ذریعے اگر اسلام کا نہیں تو اسلام کے نام لیواؤں کے جلال و جبروت اور عظمت و شوکت کا سکہ دلوں پر ضرور بیٹھا۔ قطب مینار اور آگرہ اور دہلی کے قلعوں کے بنانے والوں کے درباروں میں مسرفانہ بلکہ مشرکانہ رسوم و روایات بھی رہیں لیکن انھوں نے جب یہ عمارتیں بنائیں تو لوگوں کو ایسا نظر آیا کہ ان کے کنگوروں، برجیوں اور میناروں پر اسلام کی رفعت و حشمت کے پرچم لہرا رہے ہیں،

عجیب ستم ظریفی | لیکن ان کے دور حکومت سے لیکر آج تک کے علما، ان کو اسلام کا نمایندہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے مذہبی القاب کو محض ظاہری نمود و نمایش قرار دیتے ہیں، اور جن معاصر مورخوں نے ان کے مذہبی القاب کو سراہا ہے، ان کو چاپلوس، خوشامدی اور درباری مورخین کہتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ ستم ظریفی بھی ہے کہ خود علماء کے گروہ میں جن اہل قلم نے مسلمان فرمانرواؤں اور راجپوتوں کی لڑائیوں کا ذکر کیا ہے ان کا انداز بیان کچھ ایسا ہے کہ یہ تمام لڑائیاں اسلام اور کفر کی معرکہ آرائیاں معلوم ہوتی ہیں، اور موجودہ دور کے غیر مسلم مورخوں نے ایسے ہی بیانات کے حوالے سے ان مسلمان حکمرانوں کی تلوار کو اسلام کی تلوار قرار دیا ہے، اور ان کی خونریزی، سفاکی اور غیر مسلموں کے ساتھ بدسلوکی کو اسلامی تعلیمات کی طرف منسوب کر دیا ہے، نئے تعلیم یافتہ مسلمان اس قسم کے تاریخی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کو اپنی تاریخ کی عظمت کا احساس ہونے کے بجائے ایک قسم کا تکدر پیدا ہوتا ہے، اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی ساڑھے چھ سو سالہ تاریخ کو اسلام کی یا محض چند خاندانوں کی تاریخ قرار دیں۔ اس کشمکش سے ان کے قومی مفاخر میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے پاس ان کی گذشتہ طویل حکومت کا تاریخی سرمایہ ایسا نہیں جس پر وہ فخر کر سکیں۔ ماضی کا پرستار بن کر اس سے

چپٹے رہنا تو کسی حال میں صحیح نہیں، لیکن یہ بھی درست نہیں کہ ایک قوم کے سامنے اس کے ماضی کی تاریخ اس طرح پیش کیجائے کہ اس کو پڑھ کر اس کا سر ندامت سے جھک جائے۔ آجکل تمام قوموں میں یہ ایک عام دستور ہو گیا ہے کہ وہ اپنے داغدار اور تاریک ماضی کو تابناک اور روشن بنا رہی ہیں تاکہ ان کی مدد سے ان کا حال اور مستقبل صحت مند اور ترقی پذیر ہو۔

کیا مسلمان حکمران اسلام کے نمایندے نہ تھے؟ | یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمران اسلام کے نمایندے نہیں تھے، کیونکہ ان کی حکومتیں اسلامی اصول اور معیار پر قائم نہیں ہوئیں، لیکن یہ کہ کر مسلمانوں کو نہ صرف سیاسی نظر و فکر کی پراگندگی میں مبتلا کرنا بلکہ جذباتی طور سے ان کو ان کی تاریخ سے محروم کرنا ہے، کیونکہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جہاں بھی مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں وہ اس طرز کی نہ تھیں جن کو ہم اسلامی حکومتیں کہہ سکیں، بنی امیہ اور بنی عباس کی تاریخ اصطلاحاً تاریخ اسلام کہلاتی ہیں، حالانکہ ان کی حکومتیں بھی خلافت راشدہ کے اصولوں سے بہت دور تھیں، اس کے باوجود ان کے سیاسی، تمدنی اور معاشرتی ماحول میں زیادہ تر اسلامی اثرات نمایاں رہے، اس لیے وہ اسلامی کہلاتی رہیں، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی سیاست، تمدن اور معاشرت پر بھی اسلامی اثرات غالب تھے، اور جن مشکلات کا سامنا انکو کرنا پڑا، وہ دوسرے اسلامی ملکوں کے فرمانرواؤں کو کرنا نہیں پڑا، انھوں نے ایسے ملک پر حکومت کی جہاں کی اکثریت ان کی ہم مذہب نہ تھی، اگر وہ سراسر اسلامی آئین و قوانین جاری کرکے حکومت کرنے کی کوشش کرتے تو ان کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی، لیکن وہ اس مذہب کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے تھے جس کے نام پر وہ حکومت کرتے رہے، اس لیے اس مکتب خیال کے حامیوں کی یہ رائے نظرانداز نہیں کیجا سکتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں نے اپنے دور حکومت میں اسلام کو اس ملک میں اس طرح رکھا جس طرح کوئی بھرے ہوئے دودھ کے پیالے میں گلاب کی پنکھڑیاں رکھے۔

اور جس گروہ کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان فرماں روا صلح و جنگ، مال غنیمت، محاصل اور مداخل میں تمامتر اسلامی قوانین کے پابند نہیں رہے، ان کا کہنا بھی صحیح ہے، لیکن دوسرا گروہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اکبر کی زندگی کے آخری دور سے قطع نظر کیجائے تو ایک بھی فرمانروا ایسا نہیں گذرا جس نے اسلامی شرع کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہو، کچھ ایسے سلاطین ضرور ہوئے جنھوں نے اپنی ہوس مالی، مفاد پرستی اور دنیا طلبی کی خاطر شریعت کی خلاف ورزی کی، پھر بھی وہ اس کے منکر نہیں ہوئے، اور زیادہ تعداد ایسے حکمرانوں کی ہے جنھوں نے شرعی قوانین کے ظاہری احترام کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی اور اسی احترام کی خاطر بعض امور میں درباری علما سے ایسے فتاوے بھی حاصل کر لیتے جو در اصل درست نہ ہوتے، لیکن یہ علمائے سوء کا قصور تھا، ایک حکمراں کیسا ہی جابر ہوتا یا اس کی نجی زندگی کیسی ہی بری ہوتی، لیکن وہ علی الاعلان شریعت کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ اس کو مسلمانوں کا اعتماد اور جذبۂ اطاعت گذاری اسی وقت تک حاصل رہتا تھا، جب تک وہ شرعی قوانین کا احترام کم از کم ظاہری طور پر قائم رکھتا، پھر ازمنۂ وسطیٰ میں مذہب لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا رہا، اس لیے بادشاہ وقت مصلحۃً بھی اس کے احترام کرنے پر مجبور تھا، اور بعض تو مذہبی قوانین کی زیادہ سے زیادہ پابندی کرنے ہی میں اپنی سعادت اور مقبولیت سمجھتے تھے، سلاطین دہلی میں نومسلم حکمراں ناصر الدین خسرو کی حکومت اس لیے ختم ہوگئی کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر اسلام کی تذلیل شروع کردی تھی، اکبر جیسے جلیل القدر اور ہوشمند حکمراں کے خلاف اس کی اخیر زندگی میں مسلمانوں میں ایک عام بے چینی اس لیے پیدا ہوگئی تھی کہ اس کی وجہ سے اسلام کو نقصان پہنچ رہا تھا، اور بعض علما نے تو اس کے خلاف جہاد تک کا فتویٰ دیدیا تھا، دارا اورنگ زیب کے خلاف اس لیے بازی نہیں لے جا سکا کہ مسلمانوں کی نظر میں اس کے مذہبی عقائد مشکوک ہوگئے تھے۔

یہ گروہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کے مسلمان حکمراں کلی طور پر اسلامی شریعت کے علمبردار نہیں بن سکے، لیکن وہ اسلامی شریعت کے محافظ اور نگہبان ضرور رہے، وہ تمام اسلامی قوانین کا نفاذ تو نہیں کر سکے، لیکن انھوں نے اسلام کی عزت و ناموس کی پاسبانی ضرور کی، یہ اور بات ہے کہ ان سے ان کے ہم مذہبوں کو جتنی توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔

کیا بادشاہت غیر اسلامی طرز حکومت ہے؟

اسی گروہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ جس طرح ہمارے گذشتہ علما، صلحا، اور صوفیہ ہمارے ورثہ میں داخل ہیں، اسی طرح مسلمان فرمانروا بھی خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، ہمارے ورثہ میں ہیں، ان کے ذریعہ بھی ہماری مذہبی، تمدنی اور ثقافتی تاریخ بنی ہے، اور آج ہمارے احتجاج کے باوجود غیر مسلم مورخین انہی کے کارناموں کی روشنی میں اسلام کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں، اس لیے ان پر تنقید اور نکتہ چینی کرتے وقت ہم پر مختلف قسم کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اور ان کی بادشاہت کو محض اس لیے غیر اسلامی طرز کی کہہ کر عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، ہیں کہ یہ خلافت راشدہ کے اصول پر قائم نہیں تھی۔

حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ بڑے ہی صاحب فکر، صاحب بصیرت اور صاحب عزیمت علما تھے، جن پر ہندوستان کے مسلمانوں کو ہمیشہ ناز رہے گا، حضرت مجدد کی تجدیدی کوششوں سے ہندوستان میں اسلام کو حیات نو ملی، انھوں نے جہانگیر سے ٹکر تو لی مگر اس کی کوشش نہیں کی کہ مغلوں کی خاندانی بادشاہت کو خلافت راشدہ کے طرز حکومت میں تبدیل کردیا جائے، کیونکہ انھوں نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اس دور میں ہندوستان جیسے ملک میں بادشاہت کے علاوہ کوئی اور طرز حکومت ممکن نہیں ہے، اس لیے انقلابی قدم اٹھانے کے بجائے اصلاحی اور تجدیدی طریقہ اختیار کیا، اور بادشاہ وقت کو زیادہ سے زیادہ مذہبی بنانے کی کوشش کی، اپنے ایک مکتوب میں خان جہاں کو تحریر فرماتے ہیں کہ "سلطان روح کی طرح ہے،

اور تمام انسان بدن کی طرح ہیں، اگر روح درست ہے تو بدن بھی درست ہے، اگر روح خراب ہے تو بدن بھی خراب ہے، اس لیے اصلاح بادشاہ کی جد وجہد تمام اولاد آدم کی اصلاح کی جد وجہد ہے" اور یہ بھی فرمایا کہ بادشاہ کے لیے بد دعا تمام مخلوق کے لیے بد دعا ہے، جو بادشاہ کو نقصان پہنچاتا ہے وہ ساری مخلوق کو نقصان پہنچاتا ہے، اور جو بادشاہ کو نقصان پہنچاتا ہے، میں اس سے بیزار ہوں"

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بادشاہت اسلامی اسپرٹ کے خلاف ضرور ہے، لیکن اقتضائے زمانہ اور مصالح ملکی کی خاطر گوارا بھی کیجا سکتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں بادشاہوں کے اوصاف و فرائض بتاکر ان کو صحیح راستہ پر چلنے کی تلقین کی ہے، اس سے بھی بڑھ کر صحابۂ کرام اور بڑے بڑے ائمہ نے حالات سے مجبور ہوکر بنی امیہ اور بنی عباس کی موروثی بادشاہت قبول کرلی، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بادشاہت کو مطلق رد کر دینے والا طرز حکومت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اور اگر بادشاہت بالکل غیر اسلامی طرز حکومت ہے تو یہ مذہبی طبقہ کی بے بسی اور مجبوری کی بڑی دردناک تاریخ ہے کہ ہندوستان میں تقریباً ساڑھے چھ سو برس تک بادشاہت رہی لیکن وہ عوام کو اس کے خلاف صف آرا نہ کر سکے، حالانکہ یہی عوام معمولی سے معمولی باتوں پر علما، کے فتوی سے ایسے مشتعل اور بے قابو ہو جاتے کہ ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا، ایشیائی مزاج ہر جگہ بادشاہت ہی کو قبول کرتا رہا، اور پھر یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ اسلام میں عبادات، معاملات اور اخلاقیات کی تمام جزوی باتوں کے لیے تفصیلی احکام موجود ہیں، اس کے برخلاف سیاسی نظام کا خاکہ تو ضرور موجود ہے لیکن بہت زیادہ واضح نہیں، اسی لیے خیال ہوتا ہے کہ اسلام نے سیاسی نظام کو قصداً غیر واضح چھوڑ دیا ہے، کہ زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جیسی حکومت کی ضرورت ہوگی لوگ خود قائم کر لیا کریں گے، کیونکہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لیے موزوں ہے، اگر شروع میں اس کا کوئی مکمل سیاسی نظام مقرر کر دیا جاتا تو ممکن ہے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر ملک

کے لیے موزوں نہ ہوتا، اور اگر یہ خیال صحیح ہے تو بعض حالات میں بادشاہت بھی قابل قبول ہو سکتی ہے۔

عام طور سے بادشاہت کو غیر اسلامی طرز حکومت کہکر اس لیے برا کہا جاتا ہے کہ بہت سے بادشاہوں کی نجی زندگی اچھی نہیں رہی، اور ان کے محلوں کی زندگی قیصر و کسریٰ سے زیادہ شاندار رہی، جس کو اسلام نے مٹانے کی کوشش کی تھی لیکن ان کی شخصی برائیوں کے باوجود ان کی ذات سے مسلمانوں اور ملک کو بہت سے اجتماعی فوائد پہنچتے رہے، ایسی حالت میں ان کی نجی کمزوریوں کے پیچھے پڑنا یا ان کو غلطیوں کے لیے ندامت سے سر جھکانا یا ان کے ذاتی افعال کی وجہ سے ان کے مذہب کو زیر بحث لانا ایک بڑی غلطی اور تاریخی دیانتداری کے خلاف ہے۔ دوسری قوموں کے فرماں رواؤں کی تاریخ میں اس قسم کی بحث قصداً نظر انداز کر دی جاتی ہے۔

علماء کے قدم جمنے کا ذریعہ مسلمان بادشاہوں کی بدولت ہندوستان میں علماء اور صوفیہ کو قدم جمانے کا اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کا موقع ملا، اور ہر دور میں بکثرت علماء پیدا ہوتے رہے، سلاطین دہلی کے ابتدائی دور میں علماء زیادہ تر نیشاپور، صفاہان، غزنین، کاشان، بلخ، سجستان، خوارزم اور تبریز سے آئے، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے، اور یہ اپنے ساتھ حنفی فقہ لائے، حجاز سے آنے والے علماء کی تعداد کم رہی، اس لیے ہندوستانی فقہ میں عراقی اور ترکستانی اثرات زیادہ غالب رہے، اور یہی فقہ ہندوستان میں رائج رہی، جس کی باضابطہ تدوین فتاوی تاتارخانی اور فتاوی عالمگیری میں ہوئی۔

علماء کا شاندار اجتماع سلاطین دہلی کی حکومت میں سب سے زیادہ علاء الدین خلجی کے دور میں تھے، ان کا اتنا شاندار اجتماع ہوگیا تھا کہ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ اس وقت کی اسلامی دنیا یعنی بخارا، سمرقند، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، صفاہان، رے اور روم میں یہاں کے جیسے علماء نہیں پائے جاتے تھے جملہ علوم میں کامل دستگاہ رکھنے والے علماء یہاں موجود تھے، مولانا

ضیاء الدین برنی ان پر فخر کرتے ہوئے یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ بعض علماء تو امام غزالی اور امام رازی کے ٹکر کے تھے، اور فقہ کے بعض ماہرین کو امام ابو یوسف اور امام محمد کا مرتبہ حاصل تھا، خود امیر خسرو کو دہلی پر فخر تھا، انھوں نے اس کو قبۂ اسلام کہکر یاد کیا ہے، محمد تغلق کے زمانہ میں علماء کی تعداد اور بھی بڑھ گئی تھی، قلقشندی کا بیان ہے کہ دو سو فقہا، سلطان کے دسترخوان پر موجود ہوتے تھے، اور وہ ان سے مذہبی مذاکرے کیا کرتا تھا، فیروز شاہ تغلق فقہاء سے اس قدر متاثر تھا کہ اس نے فتاوائے فیروز شاہی کے نام سے فقہ کی تدوین کرائی، جو زیادہ مقبول نہ ہوسکی، سکندر لودی کی خوابگاہ میں، روزانہ رات کو ستر علماء جمع ہوا کرتے تھے، اور وہ ان سے فقہی مسائل دریافت کیا کرتا تھا،

عہد مغلیہ کے علماء | عہد مغلیہ میں بھی علماء کی تعداد بہت تھی، ملا عبد القادر بدایونی نے اپنے عہد کے جن ممتاز علماء کے حالات لکھے ہیں ان کی تعداد ۶۹ ہے، اسی طرح مآثر رحیمی کے مولف نے ایسے ۳۲ علماء کا ذکر کیا ہے جو عبد الرحیم خانخاناں کے دامن دولت سے وابستہ تھے، عہد عالمگیر میں جو علماء اس کے دربار میں مختلف خدمات پر مامور تھے ان کی تعداد بیالیس[۴۲] ہے، عالمگیر کے زمانہ سے مولانا شاہ عبد الرحیم کے خاندان سے جو سلسلۃ الذہب چلا اس پر مسلمانوں کو آج بھی فخر ہے، ان علماء کے ناموں پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی شیراز، کاشان، تبریز، گیلان، مشہد اور ترکستان سے کچھ علماء ضرور آتے رہے، لیکن ان کے مقابلہ میں ہندوستانی علماء کی تعداد زیادہ رہی، اور حنفی فقہ کی ترویج اور اسکی باضابطہ تدوین فتاوائے عالمگیری کی شکل میں ہوئی، جس کو عالمگیر کا ایک عظیم الشان علمی و فقہی کارنامہ سمجھا جاتا ہے، حنفی فقہ سے شافعی، مالکی، حنبلی اور شیعی فقہ کا تصادم ضرور ہوا، لیکن اکثریت حنفی فقہ کے ماننے والوں ہی کی رہی، اور یہ مغلوں کی بادشاہت کا دلچسپ پہلو ہے کہ وزارت کے عہدہ پر زیادہ تر شیعہ امراء مامور رہے، محل ایک عرصہ دراز تک راجپوت شہزادیوں کے زیر نگیں رہا، لیکن سلطنت پر حنفی فقہ کا غلبہ رہا، جو مغل فرمانرواؤں کی غیر معمولی رواداری کا ثبوت ہے، لیکن اسی کے

ساتھ حنفی علماء کے اثر انداز ہونے کی صلاحیت بھی سراہنے کے لائق ہے۔

علماء کی قسمیں | سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے دور میں علماء کی کئی قسمیں تھیں،

(۱) پہلی قسم میں وہ علماء تھے جو کسی حال میں بھی حکمران طبقہ سے میل جول رکھنا پسند نہیں کرتے تھے، بلبنی عہد میں مولانا کمال الدین زاہد بڑے پایہ کے عالم تھے، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء ان کے شاگردوں میں تھے، سلطان غیاث الدین بلبن نے ان کے پیچھے ایک بار نماز پڑھی تو اس کو لذت محسوس ہوئی، اس نے ان کو اپنا مستقل امام بنانا چاہا، انھوں نے یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کیا کہ میرے پاس نماز کے سوا اور کیا ہے، کیا سلطان اس کو بھی چھین لینا چاہتا ہے،

شاہجہانی عہد میں مولانا عبد الرشید جونپوری صاحب رشیدیہ کی شہرت پھیلی تو شاہجہان کو ان سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی، اس نے ان کو ایک قاصد کے ذریعہ اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، انھوں نے انتہائی استغنا کے ساتھ کہلا بھیجا،

دنیا اگر دہند نخیزم ز جائے خویش
من بستہ ام حنائے توکل بپائے خویش

شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار شاہ عبد الرحیم کچھ دنوں فتاوائے عالمگیری کی تصحیح کے لئے عالمگیری دربار سے وابستہ ہوگئے تھے، مگر ان کے مرشد مولانا ابو القاسم نے یہ وابستگی پسند نہیں کی اس لئے وہ اس سے علحدہ ہوگئے، ایک بار عالمگیر نے شوق ملاقات کا پیام ان کے پاس بھیجا، مگر انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا، اور ایک معمولی کاغذ پر جس میں ان کا جوتا لپیٹا ہوا تھا، یہ عبارت لکھ کر شہنشاہ ہندوستان کے پاس بھیجدی،

"اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت برا ہے جو کسی امیر کے آستانہ پر ہو، حق سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "دنیاوی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے" تم کو اس کا بھی قلیل ترین جزء ملا ہے،

اگر بالفرض اس میں سے مجھے بھی دوگے تو وہ جزو لایتجزیٰ ہوگا۔ اس ٹکڑے کے لیے میں اپنے نام کو خداوند تعالیٰ کے دفتر سے کیوں کٹواؤں، چشت کے ملفوظات میں مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے حق تعالیٰ کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے۔"

انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ صاحب اس خط کو نقل کرکے تحریر فرماتے ہیں کہ عالمگیر کو جب رقعہ ملا تو اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا، اور جب کپڑے بدلتا تو پھر اس کو جیب میں رکھ لیتا، اور فرصت کے وقت اس کو پڑھ کر روتا تھا،

پاک طینت علماء

اس طرح کے پاک طینت علماء نے اپنے کردار کو ہر حال میں اعلیٰ اور اونچا رکھا، اور ان کا عمل دوسرے علماء کے لیے نمونہ بنا، اور گو وہ اپنے کردار کی اس بلندی سے پوری قوم کو اپنا جیسا نہ بنا سکے، لیکن اس کے افراد ان سے ضرور متاثر ہوئے، ایسے علماء یا گوشہ نشین ہوکر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے یا علوم و فنون کی خدمت میں وقت صرف کرتے،

درس و تدریس میں مشغول رہنے والے علماء

(۲) دوسری قسم میں وہ علماء تھے جن کا مشغلہ درس و تدریس تھا، ہر زمانہ میں سلاطین و امراء کی سرپرستی کی وجہ سے ملک میں بکثرت مدارس تھے، انکے معلمین کے وظائف خزانہ شاہی سے مقرر ہوتے تھے، اور وہ فراغ خاطر کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہتے، ان وظائف کے لیے مدد معاش کی اصطلاح تھی، اس سے تعلیم مفت، عام اور سہل الحصول ہوگئی تھی، صبح الاعشیٰ میں ہے کہ محمد بن تغلق کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے، جن میں ایک شوافع کا باقی سب احناف کے تھے، فیروز شاہ کے دور میں اس زمانہ کا قائم کیا ہوا مدرسہ فیروز شاہی ہندوستان کا سب سے اچھا اور ممتاز مدرسہ تھا، اس کے تمام اخراجات شاہی خزانے سے ادا کیے جاتے تھے، اس کے زمانہ میں علماء و مشائخ کی تنخواہوں میں چھتیس لاکھ ٹنکے خرچ ہوتے تھے، آگرہ کے متعدد مدارس میں شیراز اور دوسرے ممالک کے معلمین تعلیم دیتے تھے، اکبر نے

فتح پور سیکری میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا تھا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی سیاح کسی دوسرے مدرسہ کا نام نہیں بتا سکتا تھا، جہانگیر نے یہ قانون بنا دیا تھا کہ اس کی مملکت میں جہاں بھی کوئی مالدار رئیس یا تاجر کسی جانشین یا وارث کے بغیر مرجاتا تو اس کی تمام جائداد اور املاک حکومت کی ملک ہوجاتی اور وہ مدرسوں اور خانقاہوں پر صرف ہوتی،

عالمگیر نے تمام شہروں اور قصبوں میں مکاتب قائم کیے، لائق اساتذہ کو وظائف اور جاگیریں دیں اور طلبہ کے لیے روزینے مقرر کیے، ان شاہی مدرسوں کے علاوہ خانقاہوں، مسجدوں اور رئیسوں کے گھروں پر بھی معلم ہوا کرتے تھے، صبح الاعشیٰ کے مصنف کا بیان ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں مختلف علم و فن کے چار سو مدرسے تھے، اور ایسے مدارس تمام صوبوں میں آخر آخر وقت تک رہے، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ماثر الکرام میں لکھتے ہیں کہ:

"صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کے بڑے حصہ میں پانچ پانچ کوس اور زیادہ سے زیادہ دس دس کوس کے فاصلہ پر شرفاء اور عالی خاندان لوگوں کی آبادی ہے، جو سلاطین و حکام کی طرف سے تنخواہ، جاگیر مدد معاش کے طور پر رکھتے ہیں، انھوں نے مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کر رکھی ہیں، جہاں اساتذہ اور مدرسین علمی فیض رسانی میں مشغول رہتے ہیں۔"

ان مدارس کے علماء خاموشی سے درس و تدریس میں لگے رہتے، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ علاء الدین خلجی کے عہد تک اتنے علماء جمع ہوگئے تھے کہ بخارا، سمرقند اور بغداد میں بھی اس پایہ کے علما نہ تھے جو منقولات، معقولات، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، اصول دین، لغت، معانی، بدیع، بیان کلام اور منطق جملہ فنون کی تعلیم دیا کرتے تھے، ان کے فیض سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، ان سے حصول تعلیم کے لیے بیرونی ممالک تک کے بھی طلبہ آیا کرتے تھے، باہر سے بھی علماء برابر آتے رہے، مثلاً منطق و فلسفہ کے مشہور امام قطب الدین رازی کے شاگردوں نے آکر ہندوستان میں درس دیا، انہی

میں فیروز شاہی عہد کے مشہور عالم مولانا جلال الدین دوانی تھے، حافظ ابن حجر کے خلیفۂ اکبر علامہ سخاوی کے
متعدد شاگردوں نے آکر ہندوستان میں حدیث کا درس دیا، جن میں مولانا رفیع الدین الایجی الشیرازی
اور مولانا راجح بن داؤد احمد آبادی زیادہ مشہور ہیں، مولانا رفیع الدین آگرہ میں مقیم رہے، سکندر لودی
ان کا بڑا معتقد تھا، مولانا راجح کا حلقۂ درس احمد آباد میں تھا۔

سکندر لودی کے عہد میں شیخ عبد اللہ تلبنی اور انکے بھائی شیخ عزیز اللہ تلبنی بڑے مشہور مدرس تھے، شیخ عبد اللہ
کے درس میں سکندر لودی چپکے سے آکر شریک ہوجاتا اور استفادہ کرتا، انکے حلقۂ درس سے چالیس جید علماء نکلے جن میں
مشہور مولانا الہداد جونپوری، میاں لادن، جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گوالیاری اور میران سید جلال بدائنی تھے،
مولانا عزیز اللہ کے حافظہ اور معلومات کی بڑی شہرت تھی، وہ مطالعہ کے بغیر مشکل سے مشکل کتابیں پڑھاتے تھے، ان ہی کے شاگردوں
میں مولانا حاتم سنبھلی تھے، جنھوں نے اپنے حلقۂ درس میں بیس بار شرح مفتاح اور چالیس بار مطول ختم کرائی۔

تیموریوں کے دور میں ان مدرسین کی بدولت ٹھٹھہ سے لیکر بنگال تک علماء اور اہل ہنر پیدا ہوتے
رہے، جونپور، ظفرآباد اور عظیم آباد میں علماء کی بڑی تعداد ہوگئی، اسی لیے شاہ جہاں کہا کرتا تھا کہ

پورب شیراز مملکت ماست

تیمور کے حملہ کے بعد قاضی شہاب الدین دولت آبادی دہلی سے جونپور آئے تو بقول استاذی المحترم
مولانا سید سلیمان ندویؒ انکے فضل و کمال سے شرق کی ساری زمین علما اٹھی کڑہ سے لیکر غازیپور تک یکساں فیض جاری ہوا،
مولانا قطب الدین ابو الغیب بن نور الدین ابی محمد المتوفی ۹۶۹ھ، ملا شیخ عبد الملک عادل فاروقی،
ملا علاء الدین عطا ملک برادر شیخ عبد الملک، شیخ محمد عیسیٰ جونپوری جیسے علماء ان کے تلامذہ میں تھے،
سید عبد الاول جونپوری ہندوستان میں پہلے شخص ہیں، جنھوں نے صحیح بخاری کی شرح فیض الباری
لکھی، اسی سرزمین سے دیوان عبد الرشید اور ملا محمود جونپوری پیدا ہوئے جن کے بارے میں مولانا شبلی
نے لکھا ہے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی کے بعد دو ایسے علمائے وقت کبھی اکٹھا نہیں ہوئے، فن مناظرہ

میں دیوان عبد الرشید کی کتاب رشیدیہ اور فلسفہ میں ملا محمود جونپوری کی شمس بازغہ سے اب تک فیض
پہنچ رہا ہے،

شاہجہانی عہد میں پنجاب بھی درس و تدریس کا بڑا مرکز رہا، اسی عہد میں ملا عبد السلام لاہوری
اور عبد السلام دیوی کے فیض سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، ملا عبد السلام دیوہ ضلع بارہ بنکی
کے رہنے والے تھے، تعلیم ملا عبد السلام لاہوری سے پائی، اور وہیں قیام کرکے درس و تدریس میں
مشغول رہے، ان ہی کے ذریعہ معقولات کا رواج ہندوستان کے مشرق و مغرب میں شروع ہوا،
ان ہی کے شاگردوں میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی تھے، جن کی تصانیف عرب و عجم تک پہنچیں، ملا دانیال چوراسی
شیخ محب اللہ الہ آبادی ملا عبد السلام دیوی کے شاگرد تھے،
اسی عہد میں ملا محمد فاضل، قاضی محمد اسلم، ملا میرک، ملا عبد اللطیف سلطانپوری، میر محمد ہاشم گیلانی،
کا سلسلۂ تلمذ بہت وسیع تھا، عالمگیری عہد میں ملا محمد یعقوب، شیخ عبد العزیز اکبرآبادی، شیخ قطب برہانپوری،
سید علی اکبر سعد اللہ خانی، ملا محمد اکرم لاہوری، حافظ ابراہیم، ملا عبد الباقی جونپوری، سید سعد اللہ سلونی
اور قاضی محب اللہ بہاری اور ملا زاہد مسند درس و تدریس پر فائز رہ کر علوم و فنون کی بڑی خدمت و اشاعت
کی، قاضی محب اللہ بہاری کی سلم و مسلم نے بقول مولانا شبلی درس نظامیہ کے نصف نصاب کو اپنے پنجے
میں تقریباً دو سو سال دبائے رکھا، ان کی مسلم الثبوت اصول فقہ میں بڑی جامع کتاب سمجھی جاتی ہے،
اس سے بھی طلبہ کو بڑا فیض پہنچا، ان میں سب سے زیادہ مشہور میر زاہد ہوئے، جن کا رسالہ میر زاہد معقولات
میں درس نظامی کی اونچی کتاب سمجھی جاتی ہے، ان ہی کے سلسلۂ تلمذ میں شاہ ولی اللہ صاحب کا
مشہور خاندان تھا،

بعض امرا کو بھی درس دینے کا شوق تھا، لبین کے مستوفی الممالک کے شاگردوں میں دہلی کے
بہت سے علماء بھی تھے، اکبری عہد کے مشہور منصب دار میر فتح اللہ شیرازی کو جب ملکی اور مالیاتی

کاموں سے فرصت ملتی تو معقولات کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے شاگرد ملا عبد السلام لاہوری تھے، جن سے مولانا عبد السلام دیوی نے تعلیم پائی۔ پھر مولانا عبد السلام دیوی کے شاگرد ملا دانیال چوراسی تھے، ان سے مولانا قطب الدین سہالوی کو شرف تلمذ تھا۔ ان سے قطب الدین شمس آبادی اور ملا امان اللہ بنارسی نے درس لیا، اور انہی کے نامور شاگرد ملا نظام الدین درس نظامیہ کے بانی ہوئے، جس سے پورے ہندوستان کو فیض پہنچا، اس طرح درس نظامیہ کی تعلیم کا سلسلہ امیر فتح اللہ شیرازی سے ملتا ہے،

ان علما میں بعض مدرسین ایسے بھی تھے جن کے ذریعہ علم حدیث کی بڑی خدمت و اشاعت ہوئی، مثلاً مولانا عنایت اللہ کشمیری (المتوفی ۱۱۲۵ھ) نے چھتیس [۳۶] بار بخاری کو مذاکرہ کے ساتھ ختم کیا۔ ایسے بھی تھے جن کو پوری صحاح ستہ اور مشکوٰۃ زبانی یاد تھی، یا ابو داؤد کو مشکوٰۃ المصابیح پوری حفظ تھی، اس لیے ان کے نام کے ساتھ مشکوٰتی لکھا جاتا تھا، حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ محمد فرخ کو ۷۰ ہزار حدیثیں سند کے ساتھ یاد تھیں، آخری دور میں مولانا رحمت اللہ الہ آبادی کو صحاح ستہ ازبر تھی۔ بعض اساتذہ کے لیے درس و تدریس ان کی روح کی غذا اور عبادت بن گئی تھی، مولانا عبد السلام لاہوری اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی ساٹھ سال تک درس دیتے رہے۔ ملا جیون نے زندگی کے آخری دن تک درس دیا، ملا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے کہ ان کے استاد مولانا عبد اللہ بدایونی اپنے گھر کا سودا خود خریدنے بازار جایا کرتے تھے، طلبہ ان کے ساتھ ہوتے اور وہ سبق پڑھاتے تھے۔

ان علماء کے تلامذہ حصول تعلیم کے بعد ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل جاتے، وہی عوام میں اسلام کے نقیب و محافظ ہوتے، یہ جوش ایمانی سے معمور ہوتے تھے اور ضرورت کے وقت اسلام کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے۔ اکثر قصبوں اور گاؤں میں شہید بابا کے

مزارات انہی کے ہیں، یہ وہ بزرگان دین ہیں جنھوں نے اسلام کی عزت و ناموس کی خاطر جانیں دیں، ان کے حالات تاریخوں اور تذکروں میں تو نہیں ملتے، لیکن ان کے مزارات کے ساتھ مقامی باشندوں کی عقیدت برابر قائم ہے۔ یہ عوامی علما، عوام کو چھوٹے بڑے مذہبی مسائل سے واقف کراتے، ان کی خلاف ورزی پر سختی کے ساتھ دار و گیر کرتے۔ ان کے فتووں کا خوف عوام پر ایسا غالب رہتا تھا کہ گو وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بہت سے غیر اسلامی اعمال کے مرتکب ہوتے مگر اسلام کو اپنے سینوں سے لگائے رکھنے ہی میں اپنی دنیاوی فلاح اور اخروی نجات سمجھتے، اور یہ انہی عوامی علما کا فیض ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے مقامی اثرات تو قبول ضرور کیے، لیکن اسلام سے بہت دور نہیں ہونے پائے۔ وہ یہاں کے باشندوں کے ساتھ گھل مل کر ضرور رہے لیکن اپنی انفرادیت کو ہر حال میں قائم رکھا، اور اپنی ہر چیز کو مذہب کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے رہے، کبھی ان کے مذہبی جذبات دب جاتے، مگر ضرورت کے وقت آسانی سے ابھر آتے، یا ابھار دیے جاتے۔ مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے حکمران طبقہ بھی برابر فائدہ اٹھاتا تھا۔

چنانچہ راجپوتوں سے جو لڑائیاں ہوئیں ان کے اسباب زیادہ تر ذاتی یا سیاسی ہوتے مگر ان کو جہاد کا رنگ دے دیا جاتا، جس سے عام مسلمانوں اور لشکریوں کی مجاہدانہ اسپرٹ ابھر آتی اور وہ غازی کا درجہ یا شہادت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے پوری جانبازی اور سرفروشی سے کام لیتے، اور جب یہ جذبہ ابھر جاتا تو بہتر سے بہتر آلات حرب اور عمدہ سے عمدہ فوجی تنظیم سے زیادہ مفید اور کارگر ثابت ہوتا،

حکمران طبقہ کے معاون علماء

(۳) تیسری قسم میں وہ علماء تھے جو حکمران طبقہ کے معاون اور مددگار رہے، گوشہ نشین علماء، ایسے علماء کو جاگیر دار، دنیا دار یا زر پرست کہتے، وہ بھی

جواب میں کہتے کہ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر عبادت و ریاضت سے عاقبت تو ضرور سنور جاتی ہے
لیکن دین اور امت کو نقصان پہنچ جاتا ہے، اور ان کا یہ کہنا بے جا بھی نہ تھا کیونکہ جو علما دربار سے
وابستہ ہوتے وہ اچھے یا برے جیسے بھی رہے ہوں، مجموعی حیثیت سے وہ دربار اور حکومت پر بہرحال
اثر انداز ہوتے، قطب الدین ایبک علما کو ہمیشہ شریعت کی انگوٹھی کے نگینے سمجھتا رہا، اور اسی وجہ سے
دہلی اہل تقویٰ اور اصحاب فتویٰ کا مسکن بن گیا، اس نے حکم دیدیا تھا کہ مسلمانوں سے غیر شرعی خراج
کے بجائے صرف شرعی خراج لیا جائے، التتمش کی مجلسوں میں علما میں بادشاہت کے نظری اور
عملی دونوں پہلوؤں پر مذاکرے ہوتے تھے، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ کو جو عزت حاصل ہوئی
ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ خدا کا شکر ادا کرے، اپنے کو گوناگوں فضائل سے آراستہ کرے، اپنے
قول و فعل اور حرکات و سکنات کو ایسا پسندیدہ بنائے کہ اہل اسلام میں اس کا اعتبار قائم اور
آخرت میں اس کی نجات ہو، اس طرح حکومت کرے کہ لوگوں کے اوصاف و اخلاق شریعت کے
مطابق ہو جائیں، ان کے معاملات صحیح ہوں، فسق و فجور ملک میں باقی نہ رہے، اپنے قہر، سطوت،
قوت، شوکت، خدم و حشم اور خزانے کو خدا اور رسول کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کرنے میں صرف
کرے، عدل و احسان کے ذریعہ ملک کو ظلم و تعدی سے پاک کرکے لوگوں میں ایسے اخلاقی فضائل
پیدا کرے کہ ساری برائیاں دور ہو جائیں، خدا ترس، متقی اور متدین قاضی، محتسب اور حکام
مقرر کرے کہ رعایا ان کی امانت اور دینداری سے مستفید ہوتی رہے، رعایا میں دینداری اور حسن اعتقاد
پیدا ہو جائے کہ ان میں غداری، مکاری، فریب، نفاق، بددیانتی، نفع خوری اور احتکار کے بجائے
دین اور حق پرستی آجائے، ایک حکمراں کو نیک، سچا، خدا ترس، دیندار اور عبادت گذار
ہونا چاہیے کیونکہ اگر اس میں خدا ترسی، دینداری، عبادت گذاری ہے تو اس کی مملکت کے تمام
[illegible] تمام ان اوصاف حسنہ سے متصف ہو جائیں گے، اور اگر

بادشاہ اور اس کے حکام میں اوصاف ذمیمہ ہیں اور وہ فسق و فجور میں مبتلا ہیں تو رعایا بھی
فاسق و فاجر ہو جاتی ہے، اور ایک حکمراں اور اس کے تمام حکام و عمال کو باطن کی آرائش میں بہت
لگا رہنا چاہیے، ظاہری آرائش تو سب ہی کرتے ہیں لیکن باطن کی آرائش ہی حکمرانی اور بادشاہ
کا سب سے بڑا وصف ہے،

علما کا اثر سلاطین پر | یہ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ تمام سلاطین ان اصولوں اور نصیحتوں کے
پابند رہے، کیونکہ سلاطین دہلی میں کیقباد، رکن الدین فیروز شاہ، علاء الدین مسعود شاہ،
قطب الدین مبارک خلجی اور ناصر خسرو جیسے نااہل، رند اور بدمست حکمراں بھی گذرے ہیں،
لیکن علما نے ان اصولوں اور نصیحتوں کا اعلان کرکے اپنا فرض ضرور انجام دیدیا اور اکابر
سلاطین میں التتمش، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن، جلال الدین خلجی، غیاث الدین تغلق،
محمد شاہ تغلق، فیروز شاہ تغلق اور سکندر لودی نے ان اصولوں پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے
کی کوشش کی، طبقات ناصری کے مؤلف نے شمسی عہد کی دہلی کو مرکز دائرۂ اسلام اور مہبط اوامر
و نواہی شریعت کہا ہے، ناصر الدین محمود نفوی کسر نفسی اور حب رسول میں اپنی مثال آپ تھا،
بلبن کا قول تھا کہ حکمرانی کے زمانہ میں ایک حکمراں سے جتنی باتیں خداوند تعالیٰ کی رضا مندی کے
خلاف ہوتی رہتی ہیں وہ معاف ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ حمیت اسلام اور شعار اسلام کو برقرار
رکھنے کی خاطر امر معروف و نہی منکر کے مطابق احکام شرعی کو رواج دینے میں کوشاں رہے،
ضیاء الدین برنی جیسے سخت گیر مورخ کو بھی اعتراف ہے کہ بلبن کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب
رہی، جلال الدین خلجی پنج وقتہ نماز کا ہمیشہ پابند رہا، سفر میں بھی روزے رکھتا، اور روزانہ
کلام پاک کا ایک پارہ تلاوت کرتا، اس پر مذہبی اثرات [illegible] غالب رہی
کہ وہ اچھا حکمراں ثابت نہیں ہوا، وہ خود کہا کرتا کہ اس کے محل کے سامنے [illegible] پرستی

ہوتی رہتی ہے لیکن وہ ان کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتا، پھر بھی جمعہ کے دن منبروں سے اس کے حامی اسلام ہونے کا اعلان ہوتا رہتا ہے،

تاتاریوں کے ساتھ وہ برابر لڑتا رہا اور اس کو خیال ہوا کہ اگر وہ مجاہد فی سبیل اللہ کا خطاب اختیار کرے تو بے محل نہ ہوگا، لیکن پھر اس کو خود ہی خیال ہوا کہ معلوم نہیں اس نے تاتاریوں سے اپنی شہرت کے خاطر جنگ کی ہے یا اعلائے کلمۃ الحق اور شہادت حاصل کرنے کے لیے، اور اسی کشمکش میں اس نے یہ لقب اختیار کرنا پسند نہیں کیا،

مولانا ضیاء الدین برنی نے غیاث الدین تغلق کی عبادت و ریاضت، پاکی نفس اور اخلاق حمیدہ کی تعریف دل کھول کر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس عہد میں احکام شریعت کے جاری کرنے کی وجہ سے قاضیوں، مفتیوں، داد بکوں اور محتسبوں کی بڑی عزت ہو گئی تھی، سلطان محمد تغلق تخت پر بیٹھا تو اس نے غیاث الدین، علاء الدین اور قطب الدین جیسے القاب اختیار کرنے کے بجائے جونا خاں کا نام بدل کر صرف محمد نام رکھا، اور کہا کہ بنی آدم میں اس سے بڑا نام کوئی اور نہیں، اس لیے کسی دوسرے لقب کی ضرورت نہیں، اس نے اپنے سکوں پر محمد بن خاتم النبیین، اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم نقش کرایا تھا، وہ نہ صرف صوم و صلوٰۃ کا بڑا پابند تھا، بلکہ نوافل و مستحبات بھی نہ چھوڑتے تھے، اس کا حکم تھا کہ جب وہ محل میں داخل ہو تو محرم عورتیں پردہ میں چلی جائیں کہ اس کی نظر ان پر نہ پڑے، ہدایہ اس کی نوک زبان تھی، فقہاء سے بڑا مناظرہ کیا کرتا، چونکہ خود بہت ہی ذہین تھا، اور تمام علوم پر گہری نظر رکھتا تھا، اس لیے بعض اوقات مجتہدانہ باتیں کرتا جس سے لوگوں کو شک ہوتا کہ مبادا وہ پیغمبری کا دعویٰ نہ کر بیٹھے، اس لیے اس کی جانب سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں، لیکن وہ جیسا بھی رہا ہو، اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی سلطنت میں مذہب کی نئی روح پھونک دی، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ سلطان کا حکم تھا کہ جو شخص جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے اس کو سزا دی جائے، اور بہت سے آدمی اس بات پر مامور تھے کہ جماعت کے وقت

جو شخص جہاں مل جائے اس کو پکڑ کر مسجد میں لے آئیں، یہاں تک کہ دیوان خانہ کے سائیس بھی پکڑ کر مسجد لائے جاتے تھے، سزا کے ڈر سے تمام لوگ بازاروں میں نماز سیکھتے پھرتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں، مذہب کو بڑا عروج حاصل ہوا، اور وہ ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ عام طور سے اس کی حکومت مذہبی حکومت سمجھی جاتی ہے، خواہ یہ حقیقت نہ رہی ہو، اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جو روپیہ بیت المال میں جمع کیا جائے وہ شریعت محمدی کے مطابق وصول شدہ ہونا چاہیے، جن ٹیکسوں کی وصولی قرآن و حدیث کے مطابق نہ ہو ان کو کسی صورت میں بھی بیت المال میں جمع نہ کیا جائے، خود فیروز شاہ کو اسلامی فقہ پر بڑا عبور تھا، اور اس نے فتاوائے فیروز شاہی مدون کرائی تھی، لیکن اسی زمانہ میں فتاوائے تاتارخانیہ بھی مرتب ہوئی جس کے سامنے فتاوائے فیروز شاہی دب کر رہ گئی،

لودی خاندان کے حکمرانوں میں سکندر لودی کا مذہبی شغف تو مورخین کے بیان کے مطابق حد افراط تک پہنچ گیا تھا، اس کی تہجد اور اشراق کی نمازیں کبھی فوت نہیں ہوئیں، علماء سے اس کی عقیدت کا ثبوت اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک بار وہ مولانا عبد اللہ سلطانپوری کے ساتھ کہیں جا رہا تھا، ایک مست ہاتھی کہیں سے آ نکلا، سکندر لودی نے اپنے کو آگے اور مولانا عبد اللہ سلطانپوری کو پیچھے کر دیا، مولانا نے سلطان سے کہا کہ کہیں تخت و تاج ایک بادشاہ سے محروم نہ ہو جائے، سلطان نے جواب دیا کہ تخت و تاج تو ایک بادشاہ کو مل جائے گا لیکن مولانا عبد اللہ سلطانپوری پھر نہ پیدا ہوں گے۔

سلاطین دہلی کی اکثریت شاہان مغلیہ کے مقابلہ میں زیادہ مذہبی رہی، وہ اپنے مذہب کو ہر حیثیت سے بلند و برتر ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہے، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اسلام کی جڑیں ہندوستان میں مضبوط نہ ہوتیں، ان کے درباروں میں ہندو اور غیر حنفی امراء کا اقتدار بھی نہ تھا، اس لیے ان کو حنفی فقہ کو رواج دینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، مغل حکمرانوں کے دور تک

فاتح اور مفتوح کی جنبیت اور دوری کم ہو گئی، اس لیے ان میں موانست اور یگانگت پیدا ہونے کے سبب مذہبی رواداری کا ہونا لازمی تھا، لیکن اس رواداری کے باوجود ان میں مذہبیت بھی رہی جو یقیناً علما کے اثر سے پیدا ہوئی،

مغل تاجداروں کی مذہبیت | شاہان مغلیہ میں بابر فطری طور پر مذہبی واقع ہوا تھا، اس نے ترکی زبان میں اپنے لڑکے کامران کے لیے ایک مثنوی مبین لکھی، جس میں مذہبی، فقہی اور اخلاقی مسائل پر دو ہزار اشعار ہیں، یہ کتاب فقہ بابری کے نام سے بھی مشہور ہوئی، وہ خواجہ عبید اللہ احراری کا مرید بھی تھا، اور علم معقول و منقول میں خراسان کے شیخ الاسلام مولانا سیف الدین احمد، علم کلام میں ملا شیخ حسن اور حدیث میں میر جمال الدین محدث کا قدردان اور معترف رہا۔

ہمایوں صوم و صلوٰۃ کا پابند رہا، وہ کبھی قسم نہ کھاتا، معمولی احکام شرعی پر اس سختی سے عمل کرتا کہ مسجد میں کبھی پہلے بایاں پاؤں اندر نہ رکھتا، اور بے وضو اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیتا۔

جہانگیر ایک راجپوت شہزادی کا فرزند اور متعدد راجپوت شہزادیوں کا شوہر تھا، لیکن اس کے باوجود یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ وہ علما کی تعلیمات سے پوری طرح متاثر رہا، ایک بار وہ ابوالفضل سے ملنے گیا، دیکھا کہ اس کے گھر پر بہت سے کاتب کلام پاک اور تفسیر کی کتابت کرنے میں مشغول تھے، ابوالفضل ہی نے اکبر کو یہ یقین دلایا تھا کہ قرآن مجید الہامی کلام نہیں بلکہ کلام رسول ہے، جہانگیر نے اپنی مذہبی بے سبب ابوالفضل ہی کو قرار دیتا تھا، اس لیے وہ کاتبوں سے لیکر تمام اوراق اکبر کے پاس لے گیا، کہا، ابوالفضل وہ ہے جب خلوت میں کچھ اور ہے اور جلوت میں کچھ اور، اور اپنی تزک میں اس نے لکھا ہے کہ ابوالفضل کو قتل کرانے میں اس کے مذہبی جذبہ کو بھی بڑا دخل تھا، جہانگیر کے تعلقات حضرت مجدد صاحب سے بہت خراب رہے، لیکن جب اچھے ہوگئے تو وہ روزانہ ان سے مغرب کے بعد ملاقات کرتا، ان دونوں سے ... کے مذہبی خیالات ... طرح ... ان کا اعتراف حضرت ... جب

نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے

شاہجہاں اہم عہدہ داروں کے تقرر میں ایسے افراد کو ترجیح دیتا تھا جو عالم بھی ہوتے تھے، اس کے دیوان کل افضل خاں شکر اللہ شیرازی کا شمار جید علما میں کیا جاتا تھا، اس کے وزیر سعد اللہ خاں کو عبد الحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں علامۃ الوریٰ و فہامۃ العصر لکھتا ہے، وہ معقولات اور منقولات کے ممتاز عالم اور حافظ قرآن بھی تھے، اسی عہد میں دانشمند خاں میر بخشی کے عہدہ پر مامور تھے، ان کا علم معقولات اور منقولات دونوں میں گہرا تھا، انھوں نے اس زمانہ کے سب سے جید عالم ملا عبد الحکیم سیالکوٹی سے ایک عہد نامہ کی نسبتیں کی تفسیر پر علمی مذاکرہ کیا تو علامہ سعد اللہ نے کہا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں کس کا علم زیادہ گہرا اور وسیع ہے

شاہجہاں کو اس کا بڑا خیال رہتا کہ ہندوستان کے علما کی علمی شان پر کوئی حرف نہ آنے پائے، اس کے عہد میں یہاں سے کچھ علما عراق گئے، وہاں ان سے پوچھا گیا کہ امام غزالی نے تہافۃ الفلاسفہ میں قدم عالم اور نفی علم واجب تعالیٰ کے مسئلہ میں شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے؟ علما نے اس کا جواب دینے سے پہلے شاہجہاں کو اس کی اطلاع دی، اس کی حمیت ابھر آئی، اس کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں اس کے وطن کے علما کی سبکی نہ ہو، اس لیے اس نے اس کے جواب میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی سے ایک رسالہ لکھوا کر عراق بھیجا،

اسی طرح اس کے عہد میں ایک ایرانی عالم آقا ناجی شاہ ایران کے سفیر بن کر اس کے دربار میں آئے، ان کو علوم عقلی و نقلی میں بڑی مہارت تھی، انھوں نے دربار کے علما سے مناظرہ کیا، ان کی قوت گویائی کے سامنے ہندوستانی علما ٹھہر نہ سکے، شاہجہاں کو اس کا دکھ ہوا، اس نے اپنے وزیر سعد اللہ خاں سے مشورہ کیا کہ کس عالم کو بلا کر ان سے مقابلہ کرایا جائے، انھوں نے ملا محمود جونپوری کو بلانے کی تجویز پیش کی، بادشاہ نے ناظم جونپور کے نام حکم بھیجا کہ ملا محمود کو بڑی منت و سماجت کے بعد بھیجے،

گوشۂ عافیت سے نکلنے کے لیے تیار ہوئے، ناظم جونپور نے ان کو بڑی شان و شوکت سے روانہ کیا، دارالسلطنت کے قریب سعد اللہ خاں اور آصف خاں نے ان کا خیر مقدم کیا، دربار میں ایرانی اور ہندوستانی عالم کی ملاقات ہوئی، اور ہیولیٰ پر مناظرہ ہوا، ملا محمود جونپوری نے اپنے تبحر علمی کا ایسا ثبوت دیا کہ ایرانی عالم نے اپنی شکست تسلیم کرکے ان کے ہاتھ چومے، اور شاہجہاں نے خوش ہوکر طشت میں بھر کر ان پر سے چاندی اور سونا نچھاور کیا اور اپنے لڑکے محمد شجاع کو ان کی شاگردی میں دیا، اور جونپور میں ان کے مدرسہ کے لیے جاگیر عطا کی۔

اورنگ زیب تو سراسر علماء کے زیر اثر رہا، اور ان کی ہدایتوں کے مطابق اس نے دربار کا رنگ ہی بدل دیا، تمام غیر شرعی اور ناجائز ٹیکس اور نذرانے بند کرادیے جن کی آمدنی کروروں سے زیادہ تھی، درشن کا غیر اسلامی طریقہ موقوف کیا، شاہجہاں نے دربار میں سجدہ تو بند کرا دیا تھا لیکن زمین بوسی کی رسم جاری تھی، عالمگیر نے اس کو بھی بند کر دیا، اس نے خورد و نوش، لباس و پوشاک، سیر و سفر کے تمام تکلفات روک دیے، یہاں تک کہ دربار میں چاندی کی دوات کے بجائے چینی کی دوات رکھنے کا حکم دیا، انعام کی رقمیں چاندی کی کشتیوں کے بجائے سپر میں پیش کی جانے لگیں، زربفت وغیرہ کے خلعت موقوف کر دیے گئے، گانا بجانا دربار میں رک گیا، تمام اضلاع میں محتسب مقرر کیے گئے، جو لوگوں کو منہیات اور ممنوعات سے باز رکھتے تھے، مسجدوں میں امام، موذن، خطیب مقرر کیے گئے، فتاویٰ عالمگیری جیسی جامع کتاب کی تدوین ہوئی، ان تمام باتوں پر خواہ پورا عمل نہ ہو سکا ہو، لیکن عالمگیر نے دربار اور اپنے ہم مذہبوں کے مزاج کو اسلامی بنانے کی پوری کوشش کی۔

(باقی)

اسلام میں علم و حکمت کا آغاز

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے

(۲)

اموی حکومت کا زمانہ

سنہ ۴۰ھ میں سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ایک خارجی کی تلوار سے شہید ہوئے اور آپ کے جانشین سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ ہوئے، آپ کے زمانہ میں عراقیوں کی اندرونی منافقت بڑھ گئی اور مجبوراً آپ نے امیر معاویہ سے صلح کرکے زمامِ خلافت انھیں تفویض کردی اور اس طرح امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے اور اموی خلافت کے ساتھ "ملک عضوض" کا زمانہ شروع ہوا،

فرقۂ معتزلہ کا آغاز

سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے منصب خلافت سے دستبردار ہوجانے کے بعد آپ کے معتقدین کے لیے سیاسی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، اور انھوں نے مساجد کے اندر علم و عبادت کے واسطے گوشہ نشینی اختیار کرلی، اسی گوشہ نشینی (اعتزال) کی وجہ سے "معتزلہ" کہلائے، تاریخ میں اس سے پہلے بھی یہ نام سنا جاتا ہے مگر اس کا مفہوم ان غیر جانبدار صحابہ سے تھا جو جنگ جمل یا جنگ صفین میں نہ حضرت علیؓ کی طرف سے شرکت کرنا چاہتے تھے نہ ان کے مخالفین کی جانب سے،

بہرحال امام حسن رضی اللہ عنہ کے خلافت سے دستبردار ہونے کے بعد اعتزال کی بنیاد پڑی اور جلد ہی اس نے ایک علمی تحریک اختیار کرلی،

امیر معاویہؓ کی سیاست

امیر معاویہ خاندانی وجاہت رکھتے تھے اور حکومتی داؤ پیچ کے ماحول میں ان کی پرورش ہوئی تھی، اور اس فن میں وہ قیصر و ہرقل کے ہم پایہ گنے جاتے تھے، ملک کے عام انداز سلطنت

کی خاطر جو اہل بیت نبوت کا طرفدار اور امویوں سے بیزار تھا، انھوں نے کلب [illegible] کو اپنا [illegible] بنایا۔

۱۔ قبائلی عصبیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے انھوں نے اپنے طرفدار قبائل کے شعراء کو نوازا۔ اس طرح شعر و شاعری کا فن جو قرآن کے اس اعلان "والشعراء یتبعھم الغاوون الم تر انھم فی کل واد یھیمون" کی وجہ سے کمزور ہو رہا تھا، پھر سے زندہ ہو گیا۔

۲۔ مسلمان عمال ذمی رعایا کی لوٹ کھسوٹ کے لیے تیار نہ تھے، لہذا انھوں نے دیوان خراج رومیوں کو سونپ دیا جس سے عیسائی نظام حکومت پر چھانے لگے۔

۳۔ امیر معاویہؓ نے اپنے بعض خاص مصالح کی خاطر عیسائی طبیب ابن اثال کو اپنا مقرب بنایا۔ حضرت امیر معاویہؓ کا دوسرا طبیب ابو الحکم تھا۔

۴۔ لیکن علم و ادب کی تاریخ پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے "تاریخ نگاری" کے فن کی سرپرستی کی اور ابو عبیدہ بن شریہ کو یمن سے بلا کر تاریخ پر کتابیں لکھنے کا حکم دیا؛ ابو عبیدہ بن شریہ کی دو کتابیں مشہور ہیں: کتاب الامثال اور کتاب الملوک و اخبار الماضیین۔

امیر معاویہؓ نے زیاد بن ابیہ کو جو پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرفداروں میں سے تھا، اپنا سوتیلا بھائی تسلیم کر لینے کا لالچ دیا [زیاد بن سمیہ ایک کلال ابو مریم خمار کی لونڈی سمیہ کے بطن سے اور غالباً امیر معاویہ کے والد ابو سفیان کے نطفہ سے تھا] یہ استلحاق "اسلامی نقطہ نظر سے بالکل ناجائز تھا، مگر زیاد کی تالیف قلب کے لیے امیر معاویہؓ نے جائز قرار دیا۔ چونکہ عوام میں اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی تھیں، ان کے سد باب کے لیے زیاد بن ابیہ نے اپنے بیٹے کے واسطے ایک مبسوط کتاب "مثالب العرب" عرب قبائل کے عیوب اور اخلاقی کمزوریوں پر لکھی۔

امیر معاویہؓ کے جانشین | امیر معاویہؓ کی وفات پر ان کا بیٹا یزید تخت نشین ہوا، جو بیشتر طور پر خوب کا بیٹا "کتاب مثالب" ... اس کا سب سے بڑا کارنامہ سبط رسول کا دردناک قتل اور مدینۃ الرسول

کی بربادی ہے، اور اسی کے لیے اس کا نام تاریخ اسلام میں "امر" ہو گیا ہے؛

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کربلا کے حادثہ فاجعہ کے مقابلے میں اس کے دو اور کارنامے ماند ہو کر رہ گئے ہیں یعنی دیار رسول کی بے حرمتی اور بیت اللہ الحرام کی سنگ باری و احراق، ابو الفرج نے لکھا ہے کہ مسیحی ابن اثال مجالس بادہ گساری میں اس کا ندیم رہتا تھا، اس کے بعد رومیوں کا مسلمانوں پر دست تطاول دراز کرنا فطری تھا۔

یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ تخت نشین ہوا، مگر جلد ہی منصب خلافت سے بیزار ہو گیا اور کچھ ہی دنوں بعد وفات پائی،

یزید کے آخری زمانہ میں عبد اللہ بن زبیرؓ نے خلافت کا دعویٰ کیا، یزید کے مرنے پر بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے، مگر شامیوں میں سے ایک جماعت نے مروان کو خلیفہ بنایا، اس کے مرنے پر اس کا بیٹا عبد الملک اس کا جانشین ہوا،

عبد الملک اور اس کے جانشین | عبد الملک خلیفہ ہونے سے قبل فقہائے وقت میں محسوب ہوتا تھا لیکن خلافت کی خوشخبری سننے کے بعد پہلا کام جو اس نے کیا یہ تھا کہ قرآن مجید کو جو اس کے سامنے رکھا ہوا تھا بند کیا اور الوداعی سلام کہا،[1] قبائلی منافرت کے سلسلے میں اس نے شعراء کی سرپرستی کو جاری رکھا۔ اخطل اس کے دربار کا خاص شاعر تھا،

حسب تصریح امام ابن تیمیہؒ عبد الملک یا عبد اللہ بن زبیرؓ کے زمانہ میں قدریت اسلام میں داخل ہوئی،

عبد الملک ہی کے زمانہ میں دیوان خراج جس پر رومی یا مجوسی چھائے ہوئے تھے، عربی میں منتقل ہوا، ورنہ پہلے مشرقی ممالک کے دیوان کا کام فارسی میں اور مغربی ممالک کا رومی زبان میں

[1] معارف: اس سے مقصود یہ تھا کہ اب امور سلطنت پر انہماک کی بنا پر کلام مجید سے زیادہ اشتغال کا موقع نہ ملے گا۔

ہوتا تھا۔ حجاج کے ایماء سے صالح بن عبد الرحمٰن نے فارسی دیوان کو عربی میں منتقل کیا، اُدھر مغربی ممالک کے دیوان خراج کو جو سرجون رومی کے زیر اہتمام تھا، ابو ثابت سلیمان بن عبد الرحمٰن نے رومی سے عربی میں منتقل کیا، اس سے عربی زبان کی اہمیت بڑھ گئی،

غیر زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی ابتدا عبد الملک کی تخت نشینی کے وقت یہ طے پایا تھا کہ اُس کے بعد یزید بن معاویہ (قاتل حسین) کا بیٹا خالد بن یزید خلیفہ ہوگا، مگر عبد الملک نے بعد میں وعدہ خلافی کی اور اس کو خلافت سے محروم کر دیا، حصول خلافت سے مایوس ہو کر خالد کیمیا کی ہوس میں پڑ گیا اور یونانی زبان سے اس فن کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرایا، ابن الندیم لکھتا ہے:-

"خالد بن یزید بن معاویہ حکیم آل مروان کے نام سے ملقب تھا، خود فاضل تھا اور علوم سے محبت رکھتا تھا، اس کے دل میں کیمیا کا شوق دامنگیر ہوا، تو اس نے حکم دیا کہ مصر میں یونانی فلاسفہ کی جو جماعت مقیم تھی اسے حاضر کیا جائے اور انھیں یونانی اور قبطی زبانوں سے کیمیا کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا اور یہ تاریخ اسلام میں پہلا موقع ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کتابیں ترجمہ ہوئیں۔"

دوسری جگہ لکھتا ہے:

الذی عنی باخراج کتب القدماء فی الصنعة خالد بن یزید بن معاویه.... هو اول من ترجم له کتب الطب والنجوم وکتب الکیمیاء	پہلا شخص جس نے علم کیمیا کی متقدمین کی کتابوں کے ترجمہ کی جانب توجہ کی وہ خالد بن یزید بن معاویہ ہے، وہ پہلا شخص ہے جس کے لیے طب، نجوم اور کیمیا کی کتابیں ترجمہ کی گئیں،

خالد بن یزید کا مترجم خاص اصطفن تھا، ابن الندیم لکھتا ہے:

"اصطفن (قدیم): اس نے خالد بن یزید کے واسطے کیمیا وغیرہ کی کتابیں ترجمہ کیں۔"

خالد نے یونانی کتابوں کا ترجمہ کرانے کے علاوہ اس فن میں خود بھی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے مندرجہ ذیل کو خود ابن الندیم نے دیکھا تھا،

کتاب الحرارات، کتاب الصحیفة الصغیر، کتاب الصحیفة الکبیر، کتاب وصیتہ الی ابنه فی الصنعة۔

عبد الملک کے بعد اس کا بیٹا ولید بن عبد الملک خلیفہ ہوا، اس کے عہد میں اسلامی فتوحات کا دائرہ اور بڑھ گیا، مغرب میں طارق نے اسپین کو اور مشرق میں محمد بن قاسم نے سندھ اور ملتان کو فتح کیا، ولید ہی نے دمشق کی جامع مسجد تعمیر کرائی،

عبد الملک اور ولید کا مشہور گورنر حجاج تھا جس کی سفاکی و بے رحمی کے قصے مشہور ہیں، اس کا طبیب خاص تیاذوق تھا جو اس موقع پر حاضر تھا جب کہ سفاک نے حضرت سعید بن جبیر کو قتل کیا تھا،

عمر بن عبد العزیزؓ ۹۹ھ میں حضرت عمر بن عبد العزیزؓ خلیفہ ہوئے، جن کے عہد حکومت نے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی، قیام عدل اور زہد میں وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر تھے، ان کے عہد خلافت کے تین واقعے مشہور ہیں:-

۱۔ انھوں نے فرقہ قدریہ کی اصلاح کی اور ان کے رشد و ہدایت سے قدریوں نے اپنی اس سوز حرکتوں کو چھوڑ دیا۔

۲۔ محض نفع رسانی خلق کے لیے انھوں نے اہرن القس کی کناش کا ماسرجویہ یہودی سے عربی میں ترجمہ کرایا۔

۳۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ہی کے عہد خلافت میں اسکندریہ کا مشہور مدرسہ فلسفہ جو بطالمۂ مصر کے زمانہ سے چلا آرہا تھا، انطاکیہ میں منتقل ہوا، ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے۔

فلما افضت الخلافة الی عمر د	جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو خلافت ملی

کے گورنر خالد بن عبد اللہ القسری کے پاس گرفتار کرکے لایا گیا۔ اس نے بقر عید کے دن اپنے ہاتھ سے اسے قتل کیا،

علم کلام کا آغاز: لیکن اس قتل و تعذیب سے اس بدعت کی شدت ختم ہونے کے بجائے اور بڑھتی گئی اور اسی "مسئلہ کلام" کے نام پر ایک مستقل علم کا نام "علم کلام" پڑ گیا، حالانکہ اس اصطلاحی علم کلام کی بنیاد بہت پہلے پڑ چکی تھی، اور اس کے قدیم نمائندے واصل بن عطا اور عمرو بن عبید ہیں۔

معتزلہ کا آغاز: لیکن وہ اس علم کے بانی نہیں ہیں، اسی طرح وہ اعتزال کے بھی بانی نہیں ہیں، اوپر ذکر آچکا ہے کہ "معتزلہ" کا نام سب سے پہلے ان صحابہ کو دیا گیا جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی بلکہ اس معاملے میں بالکل غیر جانبدار رہے،

۴۰ھ کے بعد جب سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوئے تو آپ کے متوسلین نے سیاسی سرگرمیوں کے بجائے علم و عبادت کے لیے گوشہ نشینی اختیار کی اور "معتزلہ" کہلانے لگے، غالباً اس حلقہ ارباب فکر میں اسلامی تعلیمات کو عقل کی کسوٹی پر بھی کسا جاتا تھا، اس وقت تین اہم مسئلے اس حلقہ میں زیر بحث تھے، مسئلہ خلافت و امامت، جبر و قدر، اور ایمان و کفر، چونکہ یہ اصحاب علی کرم اللہ وجہہ کا حلقہ تھا، اس لیے اصولاً حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم شدہ امر سمجھی جاتی ہوگی، مگر ایسا خیال ہوتا ہے کہ جنگ جمل کے واقعہ نے اس تسلیم شدہ امر میں اختلاف پیدا کر دیا تھا، جسے حلقہ کے متقدمین حل کر نہیں سکتے تھے، یہ کام حلقہ کے متاخرین (واصل بن عطا اور عمرو بن عبید) نے کیا،

دوسرا اہم مسئلہ جبر و قدر کا تھا، اوپر ذکر آچکا ہے کہ حسب تصریح حافظ ابن تیمیہؒ قدر کی بدعت عبد اللہ بن زبیرؓ و عبد الملک بن مروان کے زمانہ میں پیدا ہوئی لیکن کہاں سے آئی،

اسکا حتمی جواب نہیں دیا جا سکتا، عام خیال ہے کہ مجوسیوں سے آئی، اسی لیے کہا جاتا تھا کہ القدریۃ مجوس ہذہ الامۃ دوسرا خیال یہ ہے کہ یہ عیسائیوں سے آئی، تیسرا خیال ہے کہ یہودیوں سے آئی، ایک خیال یہ بھی ہے کہ خود مسلمانوں میں پیدا ہوئی، کیونکہ جب اموی حکمرانوں کو ان کے جبر و تعدی پر متنبہ کیا جاتا تو کہتے کہ تقدیر یہی تھی، اس پر بعض علما کہا کرتے تھے نہیں، وہ جھوٹے ہیں، بہرحال یہ بدعت آخر عہد صحابہ میں پیدا ہوئی اور انھوں نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا، اس بدعت کے بڑے علمبردار غیلان دمشقی اور معبد جہنی وغیرہ تھے، حضرت عمر بن عبد العزیز کے عدل و انصاف اور ان کے رشد و ہدایت سے ان لوگوں نے اس بدعت سے رجوع کیا، مگر بعد میں ان کے جانشینوں کے ظلم و ستم کی بنا پر اسی عقیدے کے قائل ہو گئے۔

جہاں تک قدیم "معتزلہ" کا تعلق ہے ان میں قدر کا عقیدہ متفق علیہ تھا، ان کی ہمنوائی میں بعض اکابر تابعین (حضرت حسن بصری) کا بھی نام لیا جاتا ہے (واللہ اعلم بالصواب)

تیسرا مسئلہ "مرتکب کبیرہ" کے ایمان و کفر کا تھا، اس باب میں خوارج نے بڑا متشددانہ رویہ اختیار کیا تھا، وہ مرتکب کبیرہ کو کافر قرار دیتے تھے، عام مسلمان ان کو فاسق، حضرت حسن بصری منافق بتاتے تھے، "معتزلہ" کے حلقہ میں جس کی سربراہی محمد بن حنفیہ کے صاحبزادگان کر رہے تھے، انھیں مومن سمجھا جاتا تھا، اور اس طرح یہ لوگ "ارجاء" کے قائل تھے،

چوتھا مسئلہ صفات باری کے اقرار و انکار کا تھا جس کی ایک فرع قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا عقیدہ ہے، مگر ابھی یہ پختگی کو نہیں پہنچا تھا،

اصطلاحی معتزلہ کا آغاز: اغانی میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ اس زمانہ میں بصرہ میں آزاد خیال منکرین کی ایک جماعت تھی جس میں چھ شخص خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، واصل بن عطا، عمرو بن عبید، صالح بن عبد القدوس، عبد الکریم بن ابی العوجاء، بشار بن برد اور ایک ازدی جو اس مجمع کا میزبان تھا، ان میں سے ہر شخص نے علیحدہ علیحدہ مسالک اختیار کیے، صالح بن عبد القدوس اور عبد الکریم بن

ابن العوجا زندیق ہوگئے، بشار بن برد متشکک ہوگیا، ازدی میزبان نے سمنی (بدھ) مذہب اختیار کرلیا، اور واصل بن عطا، اور عمرو بن عبید معتزلی ہوگئے ["اعتزال"]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب اعتزال ان دونوں کے اختیار کرنے کے پہلے سے چلا آرہا تھا، البتہ ان دونوں نے اس کی تجدید کی اور اس انہماک سے کی کہ یہ مذہب انھیں کے نام سے وابستہ ہوگیا۔

امامت کے مسئلہ میں ان لوگوں نے متحاربین کو خطاکار ٹھہرایا، واصل نے "لاعلی التعیین" اور عمرو بن عبید نے متعین طور پر۔ واصل کہتا تھا کہ اگر حضرت علیؓ اور طلحہؓ یا زبیرؓ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کسی معاملہ میں شہادت دیں تو غیر مقبول ہوگی، عمرو بن عبید کہتا تھا کہ اگر ان میں سے ایک بھی شہادت میں شریک ہو تو وہ گواہی غیر مقبول ہے۔

"قدر" کے معاملہ میں انھوں نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔

"مرتکب کبیرہ" کے مسئلہ میں واصل نے ایک چوتھا (پانچواں) قول پیش کیا کہ وہ نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ دونوں کے مابین ہے، اس طرح اس نے "المنزلۃ بین المنزلتین" کی بدعت پیدا کی، بعد میں عمرو بن عبید نے بھی اس کی تقلید کی۔

واصل نے ۱۳۱ھ میں وفات پائی، اس نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، مثلاً کتاب الخطب فی التوحید والعدل، کتاب المنزلۃ بین المنزلتین، کتاب اصناف المرجئۃ، کتاب التوبہ وغیرہ۔
واصل ہی بہ نسبت تصریح ابو ہلال العسکری (المتوفی ۳۹۵ھ) اصول فقہ کا بانی ہے۔

ابو ہلال "کتاب الاوائل" میں لکھتا ہے:

قال ابو عثمان (الجاحظ) رحمہ اللہ	ابو عثمان جاحظ نے کہا کہ عہد اسلام میں
[illegible] فی الاسلام کتاب علی امتنا	واصل بن عطاء کی کتابوں سے پہلے کسی ایسی
الثنویین ... قبل لکتب	کتاب کا پتہ نہیں جو ملاحدہ کے متعلق

واصل بن عطاء ...... وھو	وثنوں کے رد میں لکھی گئی ہو......
اول من قال: الحق یعرف من	اور سب سے پہلے واصل ہی نے بتایا کہ حق چار
وجوہ اربعۃ کتاب ناطق وخبر	طریقوں سے معلوم ہوتا ہے، قرآن، حدیث جس کی
مجتمع علیہ وحجۃ عقل و	صحت پر اتفاق ہو، قیاس عقلی اور اجماع امت،
اجماع من الامۃ	

عمرو بن عبید نے عباسی خلافت کا زمانہ پایا تھا، اس نے یا اس کے متبعین نے جہم کے مذہب تعطیل یا انکار صفات باری کو اپنے نظام عقائد میں لے لیا۔

بیرونی زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ ہشام بن عبدالملک کے زمانہ غالباً ۱۱۳ھ میں فارسی زبان کی کچھ کتابیں بھی عربی میں منتقل کرائی گئیں، ہشام کا کاتب ابو العلاء سالم تھا جو مشہور کاتب عبدالحمید ابن یحییٰ کا داماد تھا، اس نے ان رسائل کا جو ارسطاطالیس نے اسکندر کو لکھے تھے، عربی میں ترجمہ کیا، ابن ندیم لکھتا ہے:-

سالم ویکنی ابا العلاء کاتب	سالم جس کی کنیت ابو العلاء تھی، وہ ہشام
ہشام بن عبد الملک	ابن عبدالملک کا کاتب تھا......
وقد نقل من رسائل ارسطاطالیس	اس نے ارسطاطالیس کے ان رسالوں کا
الی الاسکندر	جو اس نے اسکندر کو لکھے تھے، عربی میں ترجمہ کیا،

نجوم کی پہلی کتاب احکام نجوم کی صحت پر اعتقاد اسلامی تعلیم کے خلاف ہے، اس لیے اسے عام معاشرے میں تو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، لیکن اندر ہی اندر خاموشی سے یہ اپنے قدردان پیدا کرتا رہا، سیوطی نے حماد الراویہ سے روایت کی ہے کہ ولید بن یزید (۱۲۵ھ۔۱۲۶ھ) نے دو منجموں سے اپنا زائچہ بنوایا تھا:

وقال حماد الراوية كنت يوماً	حماد الراویہ نے کہا کہ میں ایک دن ولید کے پاس
عند الوليد فدخل عليه	بیٹھا تھا کہ دو نجومی اس کے پاس حاضر ہوئے اور
منجمان فقالا نظرنا فيما امرتنا	کہا جس بات کا آپ نے ہمیں حکم دیا تھا اسے دیکھا تو ہم نے
فوجدناك تملك سبع سنين	آپ کے زائچہ میں پایا کہ آپ سات سال حکومت کریں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولید ثانی کے زمانہ تک نجوم عربی ادب میں اچھی طرح متعارف ہو چکا تھا اور اس فن پر عربی میں کافی کتابیں لکھی جانے لگی تھیں، چنانچہ نجوم کی ایک کتاب کا مخطوطہ جس کا سنہ کتابت ۱۲۵ھ ہے بحسب تصریح نلینو ویٹیکن (Vatican) کی لائبریری میں موجود ہے۔

منطق طالیسی کا ترجمہ | غالباً اسی زمانہ میں ارسطو کی قاطیغوریاس (Categories) کا عربی میں ترجمہ ہوا، کیونکہ قاضی صاعد اندلسی نے جہاں یہ لکھا ہے کہ ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں کا ترجمہ سب سے پہلے عبد اللہ بن المقفع نے کیا تھا، وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے پہلے ان کا سوائے ان میں سے پہلی کتاب کے عربی میں ترجمہ نہیں ہوا تھا۔

وذكر انه لم يترجم منه الى	عبد اللہ بن المقفع نے ذکر کیا ہے کہ اس کے زمانہ تک
وقته الا الكتاب الاول فقط	ان (کتب ثلثہ) میں سے پہلی کتاب (قاطیغوریاس)
	کے علاوہ اور کوئی کتاب ترجمہ نہیں ہوئی،

(۲) عباسی خلافت کا آغاز | ۱۳۲ھ میں انقلاب آیا، اموی خاندان تباہ و برباد ہوا، اور ان کی جگہ بنی عباس برسر اقتدار آئے، ۱۱ جمادی الآخر ۱۳۲ھ کو زاب کی مشہور جنگ نے نہ صرف امویوں اور عباسیوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، بلکہ اسلام کے آئندہ ثقافتی ڈھانچے کو بھی بدل دیا، یہ محض حکمران خاندان کی تبدیلی نہ تھی بلکہ ایک ثقافتی انقلاب تھا، "عرب کے سوز دروں" پر "عجم کے حسن طبیعت" کے غلبہ کا آغاز تھا، عباسی خلفا عجمیوں کی مدد سے برسر اقتدار آئے تھے، اس لیے ان کی حکومت گویا

خسرو انوشیروان کی حکومت کا احیا تھا، اس طرح اسلام کی تاریخ میں حکومت کی سرپرستی میں علم و حکمت کے ساتھ باقاعدہ اعتنا و اہتمام شروع ہوا،

ابو جعفر منصور ۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ | پہلا عباسی خلیفہ ابو العباس سفاح تھا، اس کا چار سالہ عہد حکومت ملک کے انقلابات کے دبانے میں گزرا، سیاسی انقلابات اپنی جلو میں جو سیاسی انتشار اور معاشرتی بحران لیکر آیا کرتے ہیں، سفاح کا زمانۂ حکومت ان کو دبانے اور جنگ و خونریزی ہی میں بسر ہوا، ۱۳۶ھ میں اس کی وفات پر اس کا بھائی ابو جعفر منصور خلیفہ ہوا جس نے ۱۵۸ھ تک حکومت کی، اس کے عہد خلافت کے پہلے نو سال علویوں کے خروج و بغاوت کو فرو کرنے میں گذرے، ۱۴۵ھ میں نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبد اللہ کے قتل کے بعد اسے اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملا، اب ملک مدعیان خلافت کی شورشوں سے پاک ہو چکا تھا، اس لیے منصور کو علوم و فنون کی نشر و اشاعت پر توجہ کرنے کا موقع ملا،

۱۴۵ھ میں منصور نے شہر بغداد کی بنیاد ڈالی جو ۱۴۹ھ کو پایۂ تکمیل کو پہنچی، اور اسی سال منصور اپنے اعیان سلطنت کے ساتھ نئے دار الخلافہ میں منتقل ہو گیا، اس طرح اس مشہور شہر کی تعمیر ظہور میں آئی جو نہ صرف آگے چل کر مشرق کی عظیم ترین سلطنت کا پایۂ تخت بنا بلکہ صدیوں تک دنیائے علم و ادب کا مرکز رہا،

تصنیف و تالیف کا آغاز | اس نئے ثقافتی انقلاب سے ملک کا گوشہ گوشہ متاثر ہوا، نشر علوم و فنون کا انداز ہی بدل گیا، اب تک علما یا تو اپنی قوت حافظہ پر اعتماد کرتے تھے، یا اپنی یادداشتوں سے نقل روایت کیا کرتے تھے، منصور کے عہد سے تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا، حافظ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں ذہبی سے روایت کیا ہے:

قال الذهبي في سنة ثلث و	ذہبی نے کہا ہے کہ ۱۴۳ھ میں علمائے اسلام

وادبعین ومائة شرع علماء الاسلام فی هذا العصر فی تدوین الحدیث والفقه والتفسیر ...... وکثر تدوین العلم وتبویبه ودونت کتب العربیة واللغة والتاریخ وایام الناس

نے حدیث، فقہ اور تفسیر کو مدون کرنا شروع کیا، ...... اس طرح علوم کی تدوین و تبویب بڑھنے لگی، اس کے علاوہ عربیت، لغت، تاریخ اور ایام الناس پر بھی کتابیں لکھی گئیں،

علم و حکمت کی سرپرستی منصور کی علم دوستی اور علماء نوازی کے باب میں، قاضی صاعد اندلسی طبقات الامم میں لکھتا ہے:-

فلما ادال الله تعالی للدولة الهاشمیة وصرف الملک الیهم ثابت الهمم عن غفلتها وهبت الفطن من میتتها وکان اول من عنی منهم بالعلوم الخلیفة الثانی ابوجعفر المنصور وکان رحمه الله مع براعته فی الفقه وتقدمه فی علم الفلسفة وخاصة فی علم صناعة النجوم کلفا بها وباهلها۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے بنی (خلافت بنی امیہ) کو بدل کر ہاشمی (عباسی) خلافت قائم کی اور انھیں ملک کا وارث بنایا تو ہمتوں میں ثبات بخشا اور ذہنوں کو بیدار کیا، اس خاندان (بنو عباس) میں پہلا شخص جس نے علوم و فنون کی طرف توجہ کی خلیفہ ثانی ابوجعفر منصور تھا جو فقہ میں دستگاہ عالی اور علم فلسفہ بالخصوص فن نجوم میں کمال رکھنے کے ساتھ ساتھ ان علوم کا شائق اور ان کے جاننے والوں کا قدردان تھا،

منصور نے صرف شرعی و لسانی علوم ہی کے ساتھ اعتنا نہیں کیا بلکہ حکمت کی سرپرستی

کی، بیرونی علوم کو بھی عربی میں منتقل کیا گیا، ابن خلدون لکھتا ہے:

فبعث ابوجعفر المنصور الی ملک الروم ان یبعث الیه بکتب التعالیم مترجمة فبعث الیه بکتاب اوقلیدس وبعض کتب الطبیعیات فقرأها المسلمون واطلعوا علی ما فیها وازدادوا حرصا علی الظفر بما بقی منها

پس خلیفہ ابوجعفر منصور نے بادشاہ روم کو کہلا بھیجا کہ وہ ریاضیات کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرا کے اسے بھیجدے، بادشاہ روم نے اقلیدس کی "اصول الہندسہ" اور طبیعیات کی کچھ کتابیں منصور کو بھیجیں جنھیں مسلمانوں نے پڑھا اور ان کے مضامین سے واقف ہوئے، اس سے ان کتابوں کے حاصل کرنے کے لیے جو روم میں باقی رہ گئی تھیں"

اس کام کے لیے دو خاص مترجم تھے، ایک ابویحییٰ البطریق اور دوسرا طبیب جرجیس۔ ابویحییٰ البطریق نے بہت سے طبی رسائل کا عربی میں ترجمہ کیا، نیز بطلیموس کی "کتاب الاربعہ مقالات" کا ترجمہ کیا، جس کی بعد میں عمر بن فرخان نے تفسیر کی۔

طب کی سرپرستی کا آغاز طب ترقی یافتہ تمدن کا لازمہ ہے، اموی خلفاء کے دربار میں بھی اطبا تھے، ان میں سے بہت سے انقلاب کے بعد دربار سے وابستہ ہو گئے، مگر زیادہ شہرت منصور اور اس کے جانشینوں کے عہد میں جندی سابور کے اطبا کو حاصل ہوئی،

۱۴۸ھ میں منصور معدہ کی بیماری میں مبتلا ہوا، مرض نے شدید شکل اختیار کر لی جب اطبائے دربار علاج سے عاجز ہو گئے تو جندی سابور سے جرجیس کو بلانے اور ان سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا، جو جندی سابور کے مدرسہ طب کا سربراہ تھا، منصور کی دعوت پر جرجیس بغداد آیا اور اس کے علاج سے منصور کو فائدہ ہوا، منصور اس کی حذاقت فنی کا اس درجہ معتقد ہوا کہ

اسے اپنا طبیب خاص بنا لیا اور بغداد ہی میں ٹھہرا لیا، جب وفات کا وقت قریب آیا تب جاکر کہیں اسے وطن جانے کی اجازت ملی،

جرجیس نے منصور کے ایما سے بہت سی طب کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

منطق کی ابتدا | مسلمانوں کی علمی پیاس اور معقولیت پسندی کا رجحان منطق کے اخذ و کسب کے لیے اجتماعی ذہن کو تیار کر رہا تھا، مگر عباسی عہد سے پہلے سوائے "قاطیغوریاس" (Categories) کے کسی اور ارسطاطالیسی منطق کی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا، لیکن منصور عباسی کے زمانہ میں مشہور ادیب عبد اللہ بن المقفع نے منطق کی پہلی تین کتابوں (قاطیغوریاس، باری ارمینیاس اور انالوطیقاے اولی) نیز فرفوریوس کی ایساغوجی کو عربی میں غالباً پہلوی سے ترجمہ کیا، قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:

ان اول علم اعتنی به من علوم	علوم فلسفہ میں سب سے پہلے منطق اور نجوم
الفلسفة علم المنطق والنجوم	کے ساتھ اعتنا کیا گیا، جہاں تک منطق کا تعلق
فاما المنطق فاول من اشتهر به	ہے سب سے پہلا شخص جو اس حکومت میں اپنی
فی هذه الدولة عبد الله بن المقفع	تصنیف و تالیف کے لیے مشہور ہوا، وہ
الخطیب الفارسی کاتب ابی جعفر	عبد اللہ بن المقفع ہے، جو مشہور ایرانی خطیب
المنصور فانه ترجم کتب	اور ابو جعفر منصور کا کاتب تھا، اس نے
ارسطاطالیس المنطقیة الثلثة	ارسطو کی منطقی کتابوں میں سے تین کتابوں
التی فی صورة المنطق وهی کتاب	کا جو منطق کی صورت (Form) کے متعلق
قاطاغوریاس وکتاب باری ارمینیاس	ہیں عربی میں ترجمہ کیا یعنی قاطیغوریاس
وکتاب انولوطیقا وذکر انه لم	(کتاب المقولات) باری ارمینیاس (کتاب العبارة)
یترجم منه الی وقته الا الکتاب	اور انالوطیقا (کتاب القیاس)۔ انھوں نے ذکر

الاول فقط وترجم ذالک	کیا ہے کہ اس کے زمانہ تک ان کتابوں
المدخل الی کتاب المنطق المعروف	میں سے پہلی کتاب (قاطیغوریاس) کے سوا
بالایساغوجی لفرفوریوس	اور کوئی کتاب ترجمہ نہیں ہوئی تھی، اسی طرح
الصوری	اس نے کتب منطق کے مقدمہ کو جو فرفوریوس صوری
	کے "ایساغوجی" کے نام سے مشہور ہے ترجمہ کیا،

قاضی صاعد کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ عبد اللہ بن المقفع کا مذکورہ بالا ترجمہ پہلا ترجمہ ہے جس کی تفصیلات تاریخ نے محفوظ رکھی ہیں، لیکن شرف اولیت کسی اور مجہول الحال مترجم کو حاصل ہوا جس نے اس سے بھی پہلے قاطیغوریاس (کتاب المقولات) کا ترجمہ کیا تھا، جیسا کہ "لم یترجم الی وقته الا الکتاب الاول" سے ظاہر ہے، ممکن ہے منطق کا یہ پہلا ترجمہ دوسری صدی ہجری کے ربع اول میں ہو چکا ہو۔

اس کے بعد لوگوں میں یونانی منطق کا شوق حد سے بڑھنے لگا، یہاں تک کہ ائمہ دین کو انھیں اس کے خلاف متنبہ کرنا پڑا، چنانچہ "اصول کافی" میں سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد مذکور ہے جو آپ نے لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے فرمایا تھا۔

"لوگ منطق میں مشغول ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ذات باری کے باب میں بھی قیل و قال کرنے لگتے ہیں، پس جب تم اس کو سنو تو کہو: نہیں کوئی معبود اس اکیلے خدا کے سوا جس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔"

عبد اللہ بن المقفع | عبد اللہ ابن المقفع ہی نے "کلیلہ و دمنہ" کا پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا، جسے ساسانی عہد میں برزویہ نے سنسکرت سے پہلوی میں ترجمہ کیا تھا، اس کے علاوہ اس نے ایران کی قومی تاریخ "خدائی نامہ" نیز دیگر فارسی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، ابن الندیم لکھتا ہے:-

"اس نے بہت سی فارسی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کیا، مثلاً خدائی نامہ، آئین نامہ، کلیلہ و دمنہ، کتاب مزدک، کتاب التاج (نوشیرواں کی سوانح عمری)، ادب الکبیر، ادب الصغیر، کتاب الیتیمہ وغیرہ"

ابن المقفع تاریخ اسلام کا سب سے بڑا زندیق تھا، بعد کے لوگ اسی کے نقش قدم پر چلے، چنانچہ خلیفہ مہدی کہا کرتا تھا:

"مجھے زندقہ کی کوئی ایسی کتاب نہیں ملی جس کی اصل ابن المقفع سے نہ ہو"

اسی شوق کے زیر اثر اس نے زنادقہ قدیم کی کتابوں کا ترجمہ کیا، مسعودی کہتا ہے:-

"مانی، ابن دیصان اور مرقیون کی کتابیں جنھیں عبداللہ ابن المقفع وغیرہ نے فارسی اور پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا"

منصور اور نجوم کی ہمت افزائی | منصور کا نجوم کی طرف طبعاً میلان تھا، جیسا کہ قاضی صاعد اندلسی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے، اسی طرح سیوطی نے محمد بن خراسانی سے نقل کیا ہے:-

"منصور پہلا خلیفہ ہے جس نے نجومیوں کو تقرب بخشا اور نجوم کے احکام پر عمل کیا،

چنانچہ جب اس نے ابراہیم بن عبداللہ کے مقابلے پر عیسیٰ بن موسیٰ کو بھیجا تو حسب تصریح ابن الاثیر اس کی ہمت بندھائی کہ خبیث یعنی منجمین کہتے ہیں کہ انجام کار فتح تمھاری ہی ہوگی، اسی طرح جب نوبخت منجم اسے فتح کی خوشخبری سنانے آیا تو انعام میں اسے ایک بڑی جاگیر دی۔

منصور کا منجم خاص نوبخت تھا، جب وہ ضعیف ہوگیا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا ابو سہل منجم باشی ہوا، نوبخت کی اولاد کا عربی ادب کی ثروت میں بڑا حصہ ہے، انھوں نے فارسی اور پہلوی سے متعدد کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، ابو سہل فضل بن نوبخت ہی آگے چل کر ہارون الرشید کے زمانہ میں بیت الحکمت (خزانۃ الحکمہ) کا لائبریرین ہوا۔

اس زمانہ کا دوسرا مشہور منجم ماشاء اللہ یہودی تھا جس نے نوبخت کے ساتھ مل کر بغداد

کی تعمیر کا نقشہ تیار کیا تھا،

علم ہندسہ کا آغاز | علم ہندسہ کی ابتدا مصر میں ہوئی تھی، جہاں وہ پیمائش زمین کے لیے اختراع کیا گیا تھا، اسی وجہ سے یونانی زبان میں جیومیٹری (Geometry) کہتے تھے، یعنی "پیمائش زمین"۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ [illegible] میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تشخیص خراج کے لیے سواد کے علاقہ کی پیمائش کرائی جس سے مسلمانوں میں علم ہندسہ کا آغاز ہوا،

یہ بھی مذکور ہو چکا ہے کہ قیصر روم نے منصور کو جو کتابیں بھیجی تھیں، ان میں اصول اقلیدس بھی تھی: "فبعث الیہ کتاب اوقلیدس"۔ ابن خلدون اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتا ہے:

کتاب اوقلیدس ہیی کتاب	کتاب اقلیدس اس کا دوسرا نام کتاب
الاصول...... اول ما	الاصول "Elements" ہے......
ترجم من کتب الیونانیین	یونانی زبان کی پہلی کتاب ہے جو مسلمانوں میں
فی الملۃ ایام ابی جعفر المنصور	بزمانہ ابی جعفر المنصور ترجمہ ہوئی،

اس سے ریاضیات و ہندسہ کے ساتھ مسلمانوں کے شغف کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ پہلی کتاب جو یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئی وہ اقلیدس ہے اور پہلی عربی کتاب جو یورپ میں چھپنے گئی وہ بھی اقلیدس ہے، جو ۱۵۹۴ء میں بمقام روم چھاپی گئی)

علم الہیئت | غالباً اس وقت بغداد میں عرب نظام فلکیات متداول تھا، جسے "علم الانواء" بھی کہتے تھے، کیونکہ اسی انداز پر ابراہیم الفزاری نے اپنی زیج مرتب کی تھی [کتاب الزیج علی سنی العرب] اور اسی انداز پر اس کے بیٹے محمد بن ابراہیم الفزاری نے خلیفہ منصور کے حکم سے "برہم سدھانت" کا ترجمہ کیا تھا، (تفصیل آگے آرہی ہے)

عرب نظام فلکیت یا علم الانواء چوتھی پانچویں صدی تک باقی رہا، بالخصوص علم الثوابت (Uranometry) میں، چنانچہ عبد الرحمن الصوفی المتوفی ۳۷۶ھ نے "صور الکواکب" میں لکھا تھا:۔

انی رایت کثیرا من الناس	میں نے دیکھا ہے کہ اکثر لوگ کواکب ثابتہ کی
یخوضون فی طلب معرفة	معرفت، آسمان میں انکے محل وقوع اور انکی
الکواکب الثابتة ومواضعها	اشکال کے بارے میں غور وخوض کرتے ہیں،
من الفلک وصورها وجدتهم	میں نے انھیں دو گروہوں میں منقسم پایا ہے
علی فرقتین ..... الفرقة	..... دوسرا گروہ ..... عربوں کے طریقہ پر
الاخری ..... سلکت طریقة	چلتا ہے جو "انواء" (نچھتروں) کی معرفت
العرب فی معرفة الانواء	پر مشتمل ہے۔

عرب پسند حضرات اس قدیم دیسی نظام یا علم الانواء پر بڑا فخر کرتے تھے، چنانچہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب الانواء یا "علم مناظر النجوم" میں لکھتا ہے:

انی رأیت علم العرب بہا هو	میں نے دیکھا ہے کہ عربوں کا علم اس فن میں
علم العلم الظاهر للعیان	ظاہر و باہر ہے، امتحان کے وقت صادق
الصادق عند الامتحان	اور خشکی کے مقیم اور سمندر کے سوار
النافع لنازل البر وراکب	اور مسافر کے لیے مفید ہے۔
البحر وابن السبیل	

دوسرا ہیئتی نظام ایرانیوں کا تھا جس کی بنیاد "زیج شہریار" (زیک شتریار) پر تھی، اسی پر نوبخت اور اس کی اولاد کا عمل تھا۔

ہندی علم الہیئت کا مسلمانوں میں داخلہ

علم ہیئت کی ترقی کے نقطۂ نظر سے منصور کا عہد حکومت اس لیے اور مشہور ہے کہ سب سے پہلے اسی کے زمانہ میں ہندوستانی ہیئت مسلمانوں میں داخل ہوئی، قاضی صاعد اندلسی نے "طبقات الامم" میں لکھتے ہیں:۔

وقد ذکر الحسین بن محمد بن	اور حسین بن محمد بن حمید المعروف
حمید المعروف بابن	بابن الادمی نے اپنی بڑی زیج معروف
الآدمی فی زیجہ الکبیر المعروف	نظم العقد میں لکھا ہے کہ ۱۵۶ھ
بنظم العقد انہ قدم علی	میں خلیفہ ابو جعفر منصور کے دربار
الخلیفة المنصور فی سنة	میں ہندوستان سے ایک شخص
ست وخمسین ومائة رجل	حاضر ہوا، جو ان کے مخصوص ہیئتی
من الهند عالم بالحساب	حساب سدھانت میں ماہر تھا۔
المعروف بالسند هند	..... اس کے ہمراہ ایک کتاب
..... فی کتاب یحتوی علی	(برہم سدھانت) بھی تھی جس میں بارہ
اثنا عشر بابا ..... فامر المنصور	باب تھے ..... منصور نے اس کتاب کے
بترجمة ذلک الکتاب الی	عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا، نیز اس کے
اللغة العربیة وان یؤلف	اصول پر علم ہیئت کی ایک کتاب لکھنے
منہ کتاب تتخذه العرب	کا حکم دیا جسے عرب حرکات کواکب کے حساب
اصلا فی حرکات الکواکب	میں اصل و مستند علیہ بنائیں، پس محمد
فتولی ذلک محمد بن ابراهیم	ابن ابراہیم الفزاری نے اس کام
الفزاری وعمل منہ کتابا	کو انجام دیا اور اس کی مدد سے

يسميه المنجمون بالسند	ایک کتاب تیار کی جسے ماہرین فلکیات
هند الكبير	"السند ہند الکبیر" کہتے ہیں۔

ابن الآدمی نے سندھی وفد کی آمد ۱۵۶ھ میں بتائی ہے، مگر البیرونی نے کتاب الہند میں لکھا ہے کہ یہ وفد ۱۵۴ھ میں آیا تھا۔

"وفی زیج الفزاری ویعقوب[له] بن طارق تلک الادوار مستفاد عن الرجل الهندی کان فی جملة وفد السند علی المنصور فی سنة اربع وخمسین ومائة۔"

بعد میں عرصہ تک اس "السند ہند الکبیر" (برہم سدھانت) پر مسلمان ہیئت دانوں کا عمل رہا، قاضی صاعد اندلسی آگے چل کر لکھتے ہیں:

وكان اهل ذلك الزمان	اس زمانہ کے لوگ خلیفہ مامون الرشید
اكثر من يعملون به الى ايام	کے عہد تک اسی پر عمل کرتے تھے،
الخليفة المامون فاختصره	تا آنکہ ابو جعفر محمد بن موسیٰ الخوارزمی
له ابو جعفر محمد بن موسى	نے مامون کے ایما سے اسے
الخوارزمی	مختصر کیا۔

برہم سدھانت" ہی کے ذریعہ مسلمان مہندسین "جیب" (sine) کے تصورات واقف ہوئے، کیونکہ ہند و ہیئت میں "اوتار" کے بجائے "جیوب" کے ذریعہ مثلثاتی حسابات کیے جاتے تھے، جو علم المثلثات کی ترقی میں پہلا قدم تھا۔

(باقی)

له: [illegible] یعقوب بن طارق [illegible] ایک ہندوستانی ادوات ماخوذ ہیں جو منصور کے پاس ۱۵۴ھ میں سندھ کے وفد میں آیا تھا۔

نارجیل سے نخیل تک

از

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

زُط، مید، سیابجہ، احامرہ، اساورہ، بیاسرہ اور تکاکرہ

سندھ اور ہند عربوں کے نزدیک قدیم زمانہ سے دو الگ الگ ملک مانے جاتے ہیں، اور وہ تغلیب کے طور پر دونوں ملکوں کے باشندوں کو ہندی بھی کہہ دیا کرتے ہیں، ورنہ عام طور سے سندھ کے باشندوں کو سندی اور ہندوستان کے لوگوں کو ہندی کہتے ہیں۔ جس طرح سندھ ایک ملک کا نام ہے، اسی طرح وہاں کی قوم کو بھی سند کہتے ہیں اور اس کی جمع سنود اور اسناد آتی ہے، اور واحد کے لیے یائے نسبتی لگا کر سندی کہتے ہیں لسان العرب میں ہے:-

والسند جيل معروف	سند ایک مشہور گروہ ہے، اس کی
والجمع أسناد وسُنُود،	جمع اسناد اور سنود آتی ہے،
وسند بلاد، تقول سندی	اور سندھ چند شہروں کے مجموعہ کا
للواحد، وسند للجماعة مثل	نام ہے، تم یہاں کے ایک آدمی کو سندی کہو گے

زنجی و زنانج — اور جمع کیلئے مسند استعمال کرینگے جیسے زنجی اور زنج ہے۔

(لسان العرب ج ۳ ص ۲۴۳ طبع جدید بیروت)

سندہ، سندیہ، سند اور سند کے نام سے سندھ میں ایک قسم کے کپڑے بنتے تھے جو عرب میں استعمال کیے جاتے تھے، جمل سندی کی طرح ثوب سندی اور دجاج سندی (سندھی مرغی) بھی اس ملک کی نسبت سے مشہور تھی، یہاں کے باشندے قدیم عرب میں بہت زیادہ آباد تھے، خاص طور سے یمن کے علاقہ میں ان کی کثرت و شوکت مسلّم تھی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایام طفولیت میں جب شاہ حبشہ ابرہہ کے بیٹے مسروق بن ابرہہ نے یمن پر حملہ کرکے سیف بن ذی یزن کو بے دخل کر دیا اور اس نے کسریٰ انوشیروان کے یہاں جاکر اس کا تذکرہ کیا تو اس نے دریافت کیا:

أی الأغربة الحبشة أم السند — کن غیر ملکیوں نے یمن پر قبضہ کیا ہے؟ حبشیوں نے یا سندھیوں نے۔

کسریٰ کے اس سوال سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت یمن میں سندھیوں کی آبادی کس قدر زیادہ تھی، اور ان کو کیسی شان و شوکت حاصل تھی،

ہند جس طرح سندھ کے مقابلہ میں ایک ملک کا نام ہے، اسی طرح اس ملک کے باشندوں کو عرب ہند کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور جمع کے لیے ہنود اور واحد کے لیے یائے نسبتی لگا کر ہندی بولتے ہیں، کبھی کبھی یائے نسبت سے پہلے کاف کا اضافہ کرکے ہندکی بھی بولتے ہیں، جس کی جمع ہنادک آتی ہے، کبھی ہندی سے عود ہندی بھی مراد لیتے ہیں، سیف مہند، سیف ہندی، سیف ہُندوانی، سیف ہندوانی، اور مہندی ہندوستان کی بنی ہوئی تلوار کو کہتے ہیں، لسان العرب میں ہے:

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۳ و طبری ج ۲ ص ۱۰۰ کتاب التیجان ص ۳۰۴

قال الأزهري والأصل في التهنيد عمل الهند، يقال سيف مهند، وهندي، وهُندواني إذا عمل ببلاد الهند واحكم عمله والمهنّد السيف المطبوع من حديد الهند، وهند اسم بلاد، والنسبة هندي، والجمع هنود، كقولك زنجي وزنوج وسيف هندواني بكسر الهاء وان شئت ضممتها اتباعاً للدال، ابن سيدة والهند جيل معروف..... ويقال رجل هندي وهندكي. قال ولو قيل ان الكاف اصل، وان هندي وهندكي اصلان بمنزلة سبط وسبطر لكان قولاً قوياً والسيف الهندواني، والمهنّد منسوب اليهم[1]

ازہری کا قول ہے کہ دراصل تہنید کے معنی ہندوستان میں یا ہندوستانیوں کا تلوار بنانا ہیں، سیف مہند، ہندی، ہندوانی اس تلوار کو کہتے ہیں جو ہندوستان میں بنائی گئی ہو، اور اس کی بناوٹ نہایت عمدہ ہو، اور مہند وہ تلوار ہے جو ہندوستان کے لوہے سے بنائی گئی ہو، اور ہند شہروں کے مجموعہ کا نام ہے، اسکی طرف نسبت ہندی ہے اور اسکی جمع ہنود آتی ہے، اور سیف ہندوانی اور ہُندوانی بھی کہتے ہیں، اور ہند ایک مشہور گروہ کا نام بھی ہے، یہاں کے باشندے کو ہندی اور ہندکی کہتے ہیں، اگر ہندکی کے کاف کو اصل مان کر سبط اور سبطر کی طرح اسے بھی مان لیا جائے تو یہ قول قوی ہے اور سیف ہندوانی اور مہند اس تلوار کو کہتے ہیں جو ہندوستانیوں کی طرف منسوب ہے۔

[1] لسان العرب ج ۳ ص ۴۳۸

ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک قصیدہ کہا ہے، جس میں ایک شعر یہ بھی ہے:

بنی امۃٍ محبوبۃٍ ھندکیۃٍ   بنی جمح عبید قیس بن عاقل[۱]

کثیر شاعر نے کہا ہے:

ومقربۃ دُھم وکمت کانّھا   طماطم یوفون الوفور ھنادکا[۲]

محمد بن حبیب نے کہا ہے کہ کثیر نے ہنادک سے رجال ہند کو مراد لیا ہے، ابن ہرمہ نے کہا ہے:

کأعناق نساء الھند   وقد شیب باوضاح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے چند ماہ پیشتر ہندوستان کے آدمیوں کا تذکرہ ایک موقع پر فرمایا تھا، جبکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت نجران سے قبیلہ بنی حارث ابن کعب کا وفد خدمت اقدس میں حاضر ہوا تھا، آپ نے ان کو دیکھکر فرمایا:

من ھؤلاء القوم؟ کأنھم رجال الھند[۳]   یہ کون لوگ ہیں جو ہندوستان کے آدمیوں کی طرح ہیں؟

الغرض عرب میں ہندیوں اور سندھیوں کی مختلف جماعتیں عہد رسالت میں موجود تھیں چنانچہ زُطّ (جاٹ)، میدؔ، سیابجہ، اساورہ، احامرہ، بیاسرہ اور تکاکرہ یہیں کے رہنے والے تھے، جو ملک عرب میں مختلف کاموں اور پیشوں کی وجہ سے مختلف ناموں سے یاد کیے جاتے تھے، ان کا مختصر تعارف یہ ہے:-

زُطّ (جاٹ)، ہندوستان کی مشہور، سیاہ رنگ کی جنگ جو قوم ہے، جو سندھ کے علاقہ منصورہ کے مضافات سے لیکر ملتان تک پھیلی ہوئی تھی، بلوچستان میں اور ہندوستان کے علاقہ پنجاب میں

[۱] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۰۹ طبع مصر [۲] لسان العرب ج ۳ ص ۴۳۰ [۳] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۱۵۷

ان کی آبادی تھی، یہ لوگ ان ہی مقامات سے عرب جاتے تھے،

میدؔ ہندوستان کی ساحلی قوم ہے جو جہازوں اور کشتیوں کو سمندر میں لوٹ لیا کرتی تھی، اس قوم کی بستیاں دریائے سندھ سے لیکر ہندوستان کے سرحدی علاقہ اور چین تک پھیلی ہوئی تھیں اور دریائے سندھ کے ساحلی مقامات سے لیکر ملتان تک ان کی آبادیاں تھیں، بلکہ گجرات اور کوکن کے سواحل میں بھی یہ سمندری لٹیرے بکثرت آباد تھے جن سے یہاں کے راجے مہاراجے تک عاجز تھے، بعد میں مسلمانوں نے ان کو زیر کیا، یہ لوگ شاہانِ ایران کی فوج میں بھرتی ہوکر عرب جاتے تھے اور ساحلی مقامات میں رہا کرتے تھے۔

سیابجہ۔ ہندوستان کی مشہور قوم سیابجہ کا وطنی تعلق بھی سندھ اور ہندوستان کے سواحل ہی سے تھا، خصوصاً سندھ کا علاقہ ان کا مرکز تھا،

احامرہ بھی یہاں کے ساحلی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، خصوصاً سندھ سے، یہ لوگ یہاں سے عرب جاکر اجرت پر تجارتی جہازوں کی حفاظت و نگرانی کیا کرتے تھے، اور بحری ڈاکوؤں سے جنگ کرتے تھے،

اساورہ شاہانِ ایران کی فوج میں "سواروں" کے ممتاز عہدے دار تھے، جو عرب میں رہتے تھے، ان میں ہندوستانی بھی ہوا کرتے تھے، ان کا وطن سندھ کے سواحل سے لیکر سرندیپ تک پھیلا ہوا تھا،

بیاسرہ بھی ہندوستانی تھے، اور عرب جاکر جہازوں کی نگرانی کی ملازمت کرتے تھے، یہ لوگ بھی سندھ سے لیکر بمبئی کے حدود صیمور (چیمور) تک کے رہنے والے تھے،

تکاکرہ (ٹھاکر) سندھ اور پنجاب کے جنگ جو بہادر تھے، جنھوں نے ہندوستان پر محمد بن قاسمؒ کے حملہ کے وقت راجہ داہر وغیرہ کی مدد میں بڑی بہادری دکھائی تھی۔

یہ چند مشہور قومیں ہیں جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے عرب میں جاتی تھیں، ان میں سے بعض وہاں آباد ہو گئی تھیں، ان کے علاوہ بھی ہندوستان کے دوسرے مقامات کے لوگ عرب میں پائے جاتے تھے،

اب ہم تفصیل کے ساتھ ان ہندوستانی قوموں اور جماعتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، جو عہد رسالت میں عرب میں پائی جاتی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت انھوں نے دعوت اسلام قبول کی یا انکار کر کے جزیہ دینا قبول کیا، اور یا عربوں اور ایرانیوں کے ساتھ مل کر جنگ کی،

زط یعنی جاٹ | جاٹ جن کو عربی زبان میں زُط کہتے ہیں، سیاہ رنگ کے خالص ہندوستانی قوم سے تھے، جو قدیم زمانے سے عرب میں بڑی تعداد میں آباد تھے، یہ قوم سندھ اور پنجاب میں پائی جاتی ہے، بلکہ بعض مورخوں نے بلوچستان کے باشندوں کو بھی جاٹ بتایا ہے، لسان العرب میں ہے:-

الزط جیل اسود من السند	زط سندھ کے سیاہ رنگ کے لوگ ہیں،
وقیل الزط اعراب جت بالهندیة	ایک قول ہے زط ہندی لفظ جٹ کا معرب ہے،
وھو جیل من اھل الھند	اور وہ ہندوستانیوں میں سے ہیں، بہر حال
وھم جنس من السودان والھنود	جاٹ سیاہ رنگ کے اور ہندوستانیوں کی
والواحد زطی، مثل الزنج	جنس سے ہیں، اس لفظ کا واحد زطی ہے
والزنجی والروم والرومی[1]	جیسے زنج اور زنجی اور روم اور رومی۔

علامہ محمد طاہر گجراتی مجمع بحار الانوار میں لکھتے ہیں۔

وھم جنس من السودان	یہ لوگ کالے رنگ کے سندھیوں اور

[1] لسان العرب ج ۷ ص ۳۰۸ مادہ زط

(السنود) والھنود[1]	ہندیوں کی جنس سے ہیں،

طریح نجفی نے مجمع البحرین میں تقریباً یہی عبارت لکھی ہے اور آخر میں یہ بھی لکھا ہے:

الزط بالضم من الھند معرب	زط ہندوستانی ہیں، یہ لفظ جت کا معرب
جت بالفتح، الواحد زطی[2]	ہے اور واحد زطی ہوتا ہے۔

ان تصریحات میں جاٹوں کو سندھی اور ہندوستانی بتایا گیا ہے، مگر ابوالفداء نے تقویم البلدان میں لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ میں بلوچیوں کو بھی جاٹ کہتے ہیں، جن کی زبان ہندوستان کی زبان سے ملتی جلتی ہے،

واما البلوص المذکورون	ان بلوچیوں کو ہمارے زمانہ میں جت
فیقال لھم فی زماننا الجت	کہا جاتا ہے، یہ ایک گروہ ہے جن کی
وھم طائفة تقرب لغتھم	زبان ہندی زبان سے قریب
من الھندیة[3]	ہے،

قدیم ترین ماہر انساب اور یمن کی تاریخ کے عالم ابو محمد عبد الملک ابن ہشام نے کتاب التیجان میں جاٹوں کو نسلی ایشیا کی قوموں میں بتایا ہے اور یمن کی قوم تبع اور تبابعہ کے حالات میں جاٹوں کو بنو یافث میں شمار کیا ہے، مثلاً تبع شمر یرعش بن ناشر النعم کے ذکر میں ہے:

وان الصغد والکرد والخزر	صغد، کرد، خزر، زط، قوط،
والزط والقوط کلھم بنو یافث	یہ سب یافث بن حضرت نوح
ابن نوح النبی صلی اللہ علیہ وسلم[4]	علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

[1] مجمع البحار ج ۲ ص ۴۲ طبع نولکشور، [2] مجمع البحرین طبع ایران مادہ زط طبع ایران [3] تقویم البلدان ص ۳۰۵ طبع پیرس [4] کتاب التیجان ص ۲۲۲ طبع حیدرآباد

دوسری جگہ اسی تذکرہ میں ہے کہ

واقبل بنو یافث باجمعهم بنا صرون	اور تمام بنو یافث تباذ کی مدد کے لیے
تباذ، وهم الترك، والديلم و	تیار ہو گئے، یہ ترک، دیلم، خزر، غور،
الخزر، والغور، والتبت، و	تبت، صغد، زط اور
الصغد، والزط، والخوز[1]	خوز ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ تبع شمر یرعش کے مقابلہ میں شاہ ایران تباذ کے مددگاروں کی فہرست ہے جس میں صغد، کرد، خزر، ترک، دیلم، غور اور تبت وغیرہ کی طرح جاٹ بھی شامل تھے، جو قدیم زمانہ میں ہندوستان سے جاکر ایران کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے تھے، اور اکاسرۂ ایران کی فوج میں ایرانیوں کی طرح رہتے تھے جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا۔ وسط ایشیا جاٹوں کا آبائی وطن نہیں ہے، بلکہ وہ ہندوستانی نسل سے تھے اور وہاں جاکر آباد ہو گئے تھے، یا پھر جاٹ کے لقب سے ان اطراف کی کوئی قوم رہی ہوگی۔

مورخوں نے جن جاٹوں کا عرب میں قدیم زمانہ سے پایا جانا بیان کیا ہے، وہ مکران بلوچستان، ملتان، دیبل وغیرہ سندھ اور اس کے اطراف کے رہنے والے تھے، قدیم عرب جغرافیہ نویس ابن خرداذبہ نے مکران اور منصورہ (سندھ) کے درمیان کئی سو میل تک جاٹوں کا علاقہ بتایا ہے، چنانچہ فہرج (ایران) سندھ کی طرف آنے والی شاہراہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

من اول مکران الی المنصورہ	مکران کے ابتدائی سرے سے لیکر منصورہ

[1] کتاب التیجان ص ۲۴۳، طبع حیدرآباد

ثلثمائة وثمانية وخمسون	تک تین سو اٹھاون فرسخ کا فاصلہ ہے
فرسخاً والطريق فی بلاد	اور پورا راستہ زط کی آبادیوں ہو کر گزرتا ہے؟
الزط وهم حفاظ الطريق[1]	یہ لوگ اس راستہ کے محافظ ہیں۔

اصطخری نے سندھ (منصورہ) سے ملتان تک کے پورے درمیانی علاقہ کو جاٹوں کا علاقہ لکھا ہے، اور اس میں ان کی آبادیاں بتائی ہیں:

وبلد السند هو المنصورة	سندھ کا ملک منصورہ اور زط کی بستیوں
واراضی الزط، وما والاها	اور اطراف و جوانب سمیت ملتان تک
الی الملتان[2]	پھیلا ہوا ہے،

ابو الفداء کی تصریح اوپر گذر چکی ہے کہ بلوچستان کے باشندے جاٹ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور ان کی زبان ہندوستان کی زبان سے قریب ہے، ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں عرب میں جو جاٹ آباد ہو گئے تھے، وہ حدود سندھ کے رہنے والے تھے، اور مکران سے لیکر پنجاب تک انکی آبادیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

ہندوستان کے جاٹ عرب میں مختلف طریقوں سے پہنچے تھے، ان میں کچھ تو ابلہ (بصرہ) سے عمان اور بحرین تک کے ساحلی علاقے میں آباد ہو کر مویشی، بھیڑ، بکری، اونٹ وغیرہ پالتے تھے، اور کچھ مستقل طور سے ساحلی شہروں اور دیہاتوں میں آباد ہو گئے تھے، اور ان کی اکثریت شاہان ایران کی فوج اور سپاہ لشکر ایران اور عرب میں رہتی تھی، اس کا مرکز عراق میں ابلہ اور جنوب میں یمن تھا، چنانچہ ایران میں قدیم زمانہ سے جاٹوں کے بڑے بڑے شہر اور بارونق بستیاں تھیں، جو فارس سے عراق تک پھیلی ہوئی تھیں،

[1] المسالک والممالک ص ۵۷ طبع یورپ [2] مسالک الممالک ص ۳۵

سوق اہواز سے فارس کی طرف جانے والی شاہراہ پر تقریباً ساٹھ میل کے بعد جاٹوں کا بہت بڑا شہر تھا، جسے ان کے نام ہی پر زطا کہا جاتا تھا، ابن خرداذبہ کا بیان ہے:

من الاهواز الى ازم ستة	اہواز سے ازم تک چھ فرسخ کی مسافت
فراسخ ومنها عبدين خمسة	ہے اور ازم سے عبدین پانچ فرسخ
فراسخ ثم الى رام هرمز	پر ہے، پھر رام ہرمز تک چھ فرسخ ہے
ستة فراسخ ثم الى الزط	پھر وہاں سے زطا چھ فرسخ
ستة فراسخ[۱]	پر ہے۔

خوزستان کے علاقہ میں جاٹوں کا عظیم الشان اور بارونق شہر تھا، جو دو[۲] علاقوں میں تقسیم تھا، اور دو ناموں سے یاد کیا جاتا تھا، ایک کو حومۃ الزط یعنی جاٹوں کا علاقہ وخطہ اور دوسرے کو خابران کہتے تھے، دونوں علاقے نہایت وسیع وعریض تھے، اور دو ندیوں کے کناروں پر آباد تھے، اصطخری نے اقلیم خوزستان کے بڑے بڑے شہروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

وحومة الزط والخابران	حومۃ الزط اور خابران دونوں
وهما واحد، والزط والخابران	ایک ہی علاقہ کے نام ہیں، زطا اور
هما كورتان عامرتان على	خابران دونوں ایک بہتے ہوئے دریا
نهرين جاريين[۲]	کے کنارے پر آباد ہیں۔

کوبل میں بھی جاٹوں کی آبادی تھی، ان ہی میں بعد میں امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت زوطی زطی بن ماہ رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، غالباً زوطی کا اسلامی نام

۱؎ المسالک والممالک ص ۴۳ ۲؎ مسالک الممالک ص ۹۴

نعمان تھا، اور وہ شاہ ایران کے مرزبان یعنی نائب حاکم تھے، اس لئے بعض روایات میں زوطی بن ماہ کے بجائے نعمان بن مرزبان آیا ہے[۱]۔

ہندوستان کے جاٹوں کے ایرانیوں کے توسط سے عرب میں جانے اور وہاں آباد ہونے کی تاریخ بلاذری نے فتوح البلدان میں "امر الاساورۃ والزط" کے ماتحت یوں لکھی ہے:

واما السيابجة والزط والاندغار	سیابجہ، زط اور اندغار ایرانیوں کی
فانهم كانوا في جند الفرس	فوج میں ان کے قیدیوں میں سے تھے،
ممن سبوه وفرضوا لهم من	اس فوج کو ایرانیوں نے سندھیوں میں
اهل السند ومن كان سبيا	شمار کرکے ان ہی کے درجہ میں رکھا تھا
من اولى الغزاة فلما سمعوا	نیز اسے بھی لڑنے والے قیدیوں کی حیثیت
بما كان من امر الاساورة	دی تھی، جب ان فوجیوں نے اساورہ کے
اسلموا واتوا ابا موسى فانزلهم	مسلمان ہونے کا واقعہ سنا تو یہ بھی مسلمان
البصرة كما انزل الاساورة[۲]	ہو کر حضرت ابوموسیٰؓ کے پاس آگئے اور

اس سے پہلے ایران کے فوجی "اساورہ" کے اسلام لانے کے سلسلے میں شیرویہ اسواری کے مسلمان ہو کر بصرہ میں آباد ہونے کے بیان میں لکھا ہے:

فانضم الى الاساورة	شیرویہ اسواری اپنی جمعیت سمیت اساورہ
السيابجة وكانوا قبل الاسلام	سیابجہ میں آکر مل گیا، یہ سیابجہ اساورہ اسلام
بالسواحل وكذلك الزط	سے پہلے خلیج عرب کے سواحل میں رہا کرتے تھے،
وكانوا بالطفوف يتتبعون الكلأ[۳]	یہی حال جاٹوں کا بھی تھا، یہ لوگ سواحل میں

۱؎ تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۳ طبع ایران قدیم ۲؎ فتوح البلدان ص ۳۶۸ ۳؎ ایضاً ص ۳۶۷

اسی باب میں علامہ بلاذری ایک جگہ لکھتے ہیں۔

وقد كان معاوية نقل من	حضرت معاویہؓ نے قدیم زمانے آباد
الزط والسيابجة القدماء	جاٹوں اور سیابجہ کی ایک جماعت کو
الى سواحل الشام وانطاكية	شام اور انطاکیہ کے سواحل پر منتقل کر کے
فشر[1]	آباد کیا۔

ان تمام تصریحات کا حاصل یہ ہے کہ جاٹ قدیم زمانہ سے ایرانیوں کی فوج میں رہتے تھے، ان سندھی سپاہیوں کو عام ایرانی سپاہیوں سے الگ قرار دیکر ان کی تنخواہوں کا معیار ایرانیوں سے جداگانہ تھا ان کی حیثیت بیگار کی سی تھی۔ اسلام سے قبل یہ ہندوستانی جاٹ خلیج عرب (خلیج فارس) کے سرسبز و شاداب سواحل ابلہ سے لیکر بحرین اور عمان تک پھیلے ہوئے تھے، اور ابلہ جس کے قریب بصرہ آباد ہوا، ان کا بہت بڑا مرکز تھا، بعد میں جب یہ لوگ مسلمان ہوگئے تو سواحل شام و انطاکیہ میں بھی ان کی بہت بڑی تعداد آباد کی گئی۔

ابلہ کے بعد جاٹوں کا دوسرا مرکزی مقام بحرین تھا، جہاں وہ عہد رسالت سے پہلے[2] بڑی تعداد میں آباد تھے۔ چنانچہ ۱۱ھ میں جب بحرین اور اس کے اطراف میں ارتداد کا فتنہ برپا ہوا تو جاٹ بھی اس کی لپیٹ میں آگئے، اور حطم بن ضبیعہ نے قطیف، ہجر اور خط میں آباد جاٹوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور اپنے ساتھ ملا لیا۔

حتى نزل القطيف وهجر	حطم بن ضبیعہ قطیف اور ہجر پہنچا، اور خط
واستغوى الخط ومن فيها	کی پوری آبادی کو اور وہاں جس قدر جاٹ
من الزط والسيابجة[3]	اور سیابجہ تھے سب کو گمراہ کرکے اپنی فوج میں

[1] فتوح البلدان ص ۱۶۹ [2] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۵۶

پھر جب اسلامی فوجوں کے مقابلہ میں ان کو ہزیمت ہوئی تو ایک بہت بڑی جماعت دارجن کی طرف بھاگی اور باقی شکست خوردہ کفار اپنے ملکوں اور قبیلوں میں چلے گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے جاٹ بھی شکست کھانے کے بعد ہندوستان کی طرف بھاگے ہوں گے۔[1]

مکہ مکرمہ میں بھی جاٹ موجود تھے اور وہاں کے لوگ ان سے اچھی طرح واقف تھے، جامع ترمذی کے ابواب الامثال کی ایک طویل حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں بطحاے مکہ میں جنوں کو دیکھا جن کی شکل و شباہت ان کے بیان کے مطابق جاٹوں کی تھی۔

فبينا انا جالس في خطي اذا	میں اپنے اردگرد کھینچے ہوئے دائرہ میں بیٹھا
اتاني رجال كانهم الزط	تھا کہ کچھ لوگ میرے قریب آئے، وہ لوگ
اشعارهم واجسامهم لا ارى	اپنے بال اور جسم میں جاٹوں کے مشابہ تھے،
عورة ولا ارى قشرا[2]	نہ میں ان کا ستر دیکھ سکا اور نہ ان کا چہرا مجھے نظر آیا۔

مدینہ منورہ میں قدیم زمانہ سے کچھ جاٹ موجود تھے جن میں سے ایک مسلمان جاٹ طبیب اور معالج تھا جس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بتایا تھا کہ ان پر ان کی باندی نے سحر کر دیا ہے۔[3]

غرض [illegible] سواحل میں پھیل جانے کے ساتھ ساتھ عرب کے بڑے بڑے مقامات میں بھی وہ آباد تھے اور ان کی خاص خاص چیزیں عربوں میں رائج اور مشہور ہوگئی تھیں، اور اپنی زندگی میں وہ ان کو برتنے لگے تھے، چنانچہ جاٹوں کے بال ترشوانے کی ایک قسم تھی جو عربوں میں رائج ہوگئی تھی۔ لسان العرب اور مجمع البحار میں ہے۔

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۳۵۶ [2] ترمذی شریف ابواب الامثال [3] الادب المفرد امام بخاری ص ۲۷ مطبع تازیہ مصر

وفی بعض الاخبار حلق راسه زطية، قيل هو مثل الصليب كانه فعل الزط[1]

بعض اخبار میں ہے کہ آپ نے جاٹوں کے طریقہ سے سر منڈایا تھا جس کی شکل صلیب کی مانند ہوتی ہے جیسا کہ جاٹوں کا طریقہ ہے۔

اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سر منڈایا تھا یا کسی صحابی وغیرہ کا واقعہ ہے، مگر ظاہری الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ ہے،

جاٹوں کی نسبت سے کپڑے بھی عرب میں مشہور تھے، لسان العرب میں ہے:

الزط جيل اسود من السند اليهم تنسب الثياب الزطية[2]

جاٹ سندھ کے سیاہ رنگ کے لوگ ہیں، ان کی طرف ثیاب زطیہ منسوب ہے۔

اس عبارت سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ ثیاب زطیہ خاص قسم کے کپڑے تھے جن کو جاٹ تیار کرتے تھے اور عرب کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے، یا پھر یہ ان کی ذاتی پوشاک کے کپڑے تھے، جیسے دھوتی وغیرہ،

جاٹوں کے ذریعہ گانے کے بعض ہندی راگ بھی غالباً قدیم زمانہ سے عربوں میں مشہور تھے اور وہ ان کے ذریعہ ہندی موسیقی سے محظوظ ہوتے تھے، اس کی تصریح اگرچہ اس دور میں نہیں ملتی، مگر جاحظ نے کتاب الحیوان میں ایک شاعر کا رجز نقل کیا ہے جس میں اس نے مچھر کی آواز کو جاٹوں کے نغمہ سے تشبیہ دی ہے، اس رجز کا ایک مصرعہ یہ ہے:

اذ تغنين غناء الزط

مچھر جاٹوں کے گانے کی طرح گا رہے تھے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں جاٹوں کا نغمہ بہت مشہور تھا۔

---

[1] لسان العرب ج ۵، ص ۳۰۰ و مجمع البحار ج ۲ ص ۹۰ [2] لسان العرب ج ۹، ص ۳۰۸

مذکورۂ بالا تصریحات سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں جاٹوں کے اطوار و عادات مشہور تھے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے جاٹ عرب میں اپنی ملکی اور قومی خصوصیات قائم رکھنے میں آزاد تھے، اور ان پر عربی زندگی اس طرح مسلط نہیں ہوئی کہ وہ اپنی ہندی زندگی کو بالکل ہی بھول گئے ہوں، یا چھوڑ بیٹھے ہوں، بلکہ انھوں نے عربی زندگی کو اپنے اطوار و عادات سے متاثر کیا، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جاٹوں نے اپنی ہندوستانی زبان خلافتِ راشدہ کے زمانہ تک محفوظ رکھی، اور وہ اسی میں گفتگو کرتے تھے، مجمع البحرین میں ہے کہ

وفی حدیث علی انه لما فرغ من قتال اهل البصرة اتاه سبعون رجلاً من الزط فکلموه بلسانهم فقالوا لعنهم الله بل انت انت[1]

(مجمع البحرین طبع ایران مادہ زط)

حضرت علیؓ کے واقعہ میں ہے کہ جب وہ اہل بصرہ سے جنگ کرکے فارغ ہوئے تو ان کی خدمت میں ستر جاٹ حاضر ہوئے اور انھوں نے اپنی زبان میں آپ سے بات کی اور کہا کہ اللہ ان (اہل بصرہ) پر لعنت کرے، کوئی اور نہیں بلکہ آپ اور صرف آپ امیر و حاکم ہیں۔

اس کا صریح مطلب یہ ہے کہ بصرہ کے جاٹوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت تک اپنی ملکی اور قومی زبان ہندی کو محفوظ رکھا تھا، اور وہ اسی میں گفتگو کرتے تھے، اور انھوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کا اقرار کیا، یہی وجہ ہے کہ عرب کے جن علاقوں میں یہ ہندوستانی آباد تھے، خصوصیت سے بحرین وغیرہ کے ساحلی اطراف میں، وہاں کے عربوں کی زبان ان کی زبان کے اختلاط کی وجہ سے غیر فصیح اور غیر معتبر ہو گئی تھی، چنانچہ قبیلہ بنو عبد القیس اور ازد عمان کی زبان اس لیے غیر مستند قرار پائی کہ وہ لوگ بحرین میں ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے اختلاط کی

وجہ سے حریت کا جوہر کھو چکے تھے، یہی حال لین والوں کا تھا۔

عہد رسالت میں جاٹوں سے مسلمان اچھی طرح واقف تھے، اور ان میں ان کی رنگت، شکل و شباہت اور لباس و ہیئت وغیرہ مشہور تھی، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی وہ روایت گذر چکی ہے جس میں انھوں نے ایک مخلوق کو جاٹوں سے تشبیہ دی ہے اور ان کے لمبے لمبے بالوں اور موٹے تازے جسموں کو خاص طور سے بیان فرمایا ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جسمانیت میں جاٹوں سے تشبیہ دی ہے، مجمع البحار میں "زط" کے بیان میں ہے۔

وأما موسیٰ فآدم سبط کانہ من رجال الزط، ھو لجنس الزای وشدۃ المھملۃ [1]

موسیٰ گندمی رنگ کے خوش قامت تھے، گویا وہ جاٹوں میں سے تھے۔

اسی طرح جب سنہ ۱۰ نبوت میں نجران سے بنی حارث بن کعب کے مسلمانوں کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کو دیکھکر فرمایا:

من ھؤلاء القوم الذی کانھم رجال الھند [2]

یہ کون لوگ ہیں جو ہندوستان کے آدمی معلوم ہوتے ہیں

جاٹوں نے اپنی خصوصیت باقی رکھتے ہوئے اپنے کو عربی زندگی سے اس طرح ہم آہنگ کر لیا تھا کہ عربوں کے اجتماعی معاملات میں ان کا ساتھ دیتے تھے، اور مختلف قبائل کے موالی و حلفاء بنکر ان کے طرفداروں میں شمار ہوتے تھے، جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ تلیف، ہجر، خط وغیرہ ساحلی علاقوں کے جاٹ ارتداد کے زمانہ میں حطم بن ضبیعہ کے ساتھ

[1] مجمع البحار ج ۲ ص ۲۳ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۹۴ و تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۶

خلافت صدیقی کے خلاف کفار و مشرکین کے ساتھ نکلے تھے، اسی یمامہ کی جنگ میں اسی زمانہ میں مسیلمۃ الکذاب کی فوج کے پاس جو ہندی تلواریں تھیں، وہ غالباً نجران و نجد کے جاٹوں ہی کی تھیں۔

بعد میں یہ لوگ بحرین کے مشہور قبیلہ بنو عبد القیس کے خاص حلیف اور طرفدار بن گئے تھے، عوام بن عبد اللہ کا قول ہے

ویکفی الزط عبد القیس عنا وتکفینا الاساورۃ المزونا

ہمارے مقابلہ میں عبد القیس کو جاٹ کافی ہیں اور ہمارے لیے اساورہ کافی ہیں۔

اسی طرح وہ عرب کے مشہور قبیلہ بنو تمیم کے بھی حلیف و ہمنوا تھے، اور قبائلی لڑائیوں میں ان کی مدد کرتے تھے، ایک شاعر کہتا ہے:

فجئنا بحی وائل وبلفها وجاءت تمیم زطها والاساورا [1]

ہم وائل کے دونوں قبیلوں اور اسکے دوستوں کو لیکر آئے اور بنو تمیم اپنے جاٹوں اور اساورہ کو لیکر آئے

جاٹوں کی یہ روش عہد اسلام میں بھی قائم رہی اور وہ اسلام لانے کے بعد بھی اپنی پسند سے کسی نہ کسی قبیلہ کے حلیف بنکر ان کے ساتھ رہتے تھے، اور اسکی معیت میں اسلامی غزوات میں شریک ہوتے تھے، چنانچہ سنہ ۱۴ھ کے بعد بصرہ کے جاٹ اور سیابجہ بنو حنظلہ کے ساتھ رہتے تھے، اور مشرکین سے جہاد کرنے کے لیے ان کے ساتھ نکلتے تھے [2]۔ اس سلسلہ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جاٹوں نے حتی الامکان غیر جانبداری پر عمل کیا اور کھل کر مسلمانوں اور عربوں کے اندرونی معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا، بحرین کے جاٹ حطم بن ضبیعہ کے دباؤ میں آکر عہد صدیقی میں اسلامی فوج کے مقابلہ میں ضرور آئے مگر اسلام لانے کے بعد انھوں نے

[1] لسان العرب ج ۷، ص ۳۰۸ [2] فتوح البلدان ص ۳۶۷

بھی غیر جانبداری کی پالیسی کو برقرار رکھا، اور مسلمانوں کے آپس کے معاملات میں شریک نہیں ہوئے، بلاذری کی شہادت ہے:

ولم يشهدوا معهم الجمل	ان لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ
وصفين ولا شيئاً من	جمل میں نہ جنگ صفین میں اور نہ ہی کسی
حروبهم[1]	اور جنگ میں شرکت کی۔

بصرہ کے مسلمان جاٹوں سے یہ شرط کرلی گئی تھی کہ وہ عربوں کے داخلی معاملات میں نہ پڑیں گے اور کسی جماعت کے مقابلہ میں دوسری جماعت کی مدد نہیں کریں گے۔ لیکن بعد میں حالات کے تقاضے سے ان کو مسلمانوں کی آپس کی لڑائیوں اور تحریکوں میں کسی نہ کسی فریق کا ساتھ دینا پڑا، چنانچہ جمل اور صفین کے بعد یوم مسعود اور یوم ذبدہ میں انھوں نے حصہ لیا، اور عبدالرحمن بن اشعث نے جب بنو امیہ کے خلاف قراء کی جماعت کے ساتھ خروج کیا تو جاٹ اور سیابجہ بھی کھل کر اس میں شریک ہوئے، حجاج بن یوسف نے اس بدعہدی کے جرم میں ان کے مکانات مسمار کرادیے، وظیفے بند کردیے، اور ان کو جلاوطن کردیا،[2] اس کے بعد جاٹوں کی جمعیت منتشر ہوگئی، اور انھوں نے اس کے انتقام میں بصرہ، اور بغداد کے اطراف میں بڑی شورش برپا کی اور ان کو تباہ و برباد کردیا گیا۔

عہد رسالت میں جاٹوں کے اسلام کی تصریح ابتک ہم کو نہیں مل سکی اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ ان کی کوئی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام لائی تھی، مگر یہ قطعی ہے کہ عہد رسالت میں یمن اور بحرین کے حدود کے بعض جاٹ مسلمان ہوئے تھے، چنانچہ حضرت بیرزطن ہندی یمنی جو عہد رسالت میں اسلام لائے غالباً جاٹ نسل سے تھے، البتہ عہد فاروقی میں

[1] فتوح البلدان ص ۳۷۶ [2] ایضاً

جب ۱۴ھ میں بصرہ آباد کیا گیا تو یہاں مسلمان جاٹوں کی بڑی تعداد موجود تھی، جو بنو حنظلہ کے ساتھ رہتی تھی، اور جب ایران کے اساورہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام لائے تو وہ بصرہ میں ان ہی مسلمان جاٹوں اور سیابجہ کے ساتھ رہنے لگے، مگر جب ان ایرانی اور ہندستانی مسلمانوں کی بڑی تعداد اکٹھا ہوگئی تو بنو تمیم نے ان کو اپنی طرف کھینچا اور اساورہ بنو سعد کے یہاں چلے گئے اور جاٹ اور سیابجہ بنو حنظلہ سے مل گئے،

بعد میں حجاج بن یوسف نے سندھ سے جاٹوں کو اور دوسری قوموں کو ان کے بال بچوں سمیت بلاکر مقام کسکر کے نشیبی سنگلاخ حصہ میں آباد کیا، جنھوں نے یہاں اچھی خاصی طاقت جمع کرلی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بہت سے غلاموں اور بنو باہلہ کے موالی اور محمد بن سلیمان بن علی کے ننھیال کے لوگوں نے بھاگ کر یہاں آکر پناہ لی اور ڈاکہ زنی اور حکومت کی مخالفت ورہزنی شروع کردی، اس سے پہلے بھی یہ جاٹ کشتیوں کو لوٹ لیتے تھے، پھر رفتہ رفتہ ان کی جمعیت کے ساتھ ان کی جرأت طاقت بھی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ مامون کے زمانہ میں انھوں نے بصرہ کا تمام نشیبی علاقہ اپنے قبضہ میں کرلیا، اور بصرہ سے جو کشتی اور جہاز بغداد جاتا اس کو لوٹ لیتے جس سے بغداد اور بصرہ کے درمیان بحری سفر اور حمل و نقل کا سلسلہ بند ہوگیا، اور اس کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، خلیفہ معتصم نے اپنے زمانہ میں ان جاٹوں کے خلاف فوجی کارروائی کی اور ان کی سرکوبی کیلئے خراسان کے ایک فوجی افسر عجیف بن عنبسہ کی سرکردگی میں فوج روانہ کی عجیف بن عنبسہ کو پورا اختیار دیا کہ اس مہم میں جتنا بھی صرف ہو بے تکلف خرچ کیا جائے، عجیف نے بڑے اہتمام سے جاٹوں کا مقابلہ کیا، اور ان کو شکست دی اور گرفتار کرکے بغداد لایا، اور پھر ان لوگوں کو خانقین میں رکھا گیا اور زیادہ تعداد عین زربہ اور دوسری سرحدوں کی طرف بھیجدی گئی،

ابن اثیر کا بیان ہے کہ بحرین کے علاقہ خط میں جاٹ اور سیابجہ آباد تھے، مامون نے ۲۰۵ھ میں ان سے جنگ کرنے کے لئے عیسیٰ بن یزید جلودی کو پھر ۲۰۶ھ میں داؤد بن ماسجور کو متعین کیا، اس کے

بعد ۲۱۹ھ میں عجیف بن عنبسہ نے ان کو زیر کیا،

مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف میں لکھا ہے کہ معتصم کے زمانہ میں ہندوستان کے بہت سے جہاز گرفتار کیے گئے، ان میں ایک بہت بڑی جمعیت بھی جو ساحل فارس، عمان اور بصرہ کے اطراف میں قبضہ جمائے ہوئے تھی، پھر معتصم نے ان جاٹوں کا استیصال کیا جو بصرہ کے نشیبی اور بصرہ اور واسط کے درمیانی علاقہ میں ڈاکہ زنی اور قتل و خونریزی کیا کرتے تھے، ہندوستان کے قحط اور گرانی کی وجہ سے یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں نقل مکان کر کے کرمان، فارس اور اہواز کے علاقہ میں آکر آباد ہوگئے، اور ان کو یہاں غلبہ حاصل ہوگیا، معتصم نے ان کو وہاں سے نکال کر خانقین اور جلولا میں اور شام کے شہر عین زربہ میں آباد کیا، اسی کے بعد سے ملک شام میں بھینسوں کا رواج ہوا، اس سے پہلے وہاں کے لوگوں نے بھینس نہیں دیکھی تھی،[۱]

یہ ہے ہندوستان کے ان جاٹوں کی مختصر تاریخ جو قدیم زمانہ سے عرب میں آباد تھے، اور اسلامی دور میں انھوں نے بصرہ اور بغداد کے درمیان اپنی ایک آزاد ریاست قائم کرنے کی کوشش کی اور خلافت اموی اور خلافت عباسی میں بڑی شورش برپا کی تھی، اس لیے حکومت کو ان کا استیصال کرنا پڑا۔

جاٹوں میں بعض بڑی اور مشہور شخصیتیں بھی گذری ہیں، مثلاً ابو سالم زطی، یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بصرہ میں زط و سیابجہ کے حاکم مقرر کیے گئے تھے، نہایت صالح اور نیک بزرگ تھے، محمد بن عثمان زطی بصری کو جاٹوں نے اپنے غلبہ و فتنہ کے زمانہ میں اپنا حاکم بنایا تھا، اسی زمانہ میں انھوں نے سملق زطی نامی ایک شخص کو بھی اپنا امیر بنایا تھا، ان کے تفصیلی حالات کے لیے تاریخ ابن خلدون اور رجال السند والہند ملاحظہ ہوں۔

(باقی)

[۱] رجال السند والہند ص ۲۰۳ تا ۲۰۵ ذکر ابو سالم زطی

دیوان ظہیر اور اس کا مصنف،

از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خانصاحب صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد

فارسی کے مشہور شاعر ظہیر فاریابی (المتوفی ۵۹۸ھ/۱۲۰۱ء) سے غزلیات کا ایک دیوان بھی منسوب کر دیا گیا ہے جو نولکشور پریس، لکھنؤ سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا، اور اس کے سرورق پر اس شاعر کی تعریف کا ایک مشہور شعر درج ہے،

دیوانِ ظہیر فاریابی در کعبہ بدزد اگر بیابی

لیکن اگر ان غزلیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ظہیر یقیناً بعد کے عہد سے تعلق رکھتا ہوگا، اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں:-

(۱) ہر غزل میں مقطع (شاعر کا تخلص) موجود ہے جو چھٹی صدی ہجری میں عموماً رائج نہیں تھا، سنائی (م ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء) جو فارسی غزل کے بانی کہے جا سکتے ہیں، اپنی غزلوں میں شاذ و نادر ہی تخلص لاتے ہیں، یہی حال سید حسن غزنوی (م ۵۵۶ھ/۱۱۶۱ء)، فلکی شروانی (م ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء)، انوری (م ۵۸۵ھ/۱۱۸۹ء)، جمال الدین اصفہانی (م ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء) وغیرہ کا ہے، صرف خاقانی (م ۵۹۵ھ/۱۱۹۵ء) کے یہاں تخلص کا التزام نظر آتا ہے، لیکن پھر کمال الدین اسمٰعیل (م ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء) کے یہاں نہیں ہے۔

(۲) شاعر نے بعض ایسی کتابوں کا استعارۃً ذکر کیا ہے جو ظہیر فاریابی سے بہت بعد کی ہیں، مثلاً کیمیائے سعادت (غزالی۔ م ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء)، مخزن اسرار (نظامی (م ۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء)

گلشن راز (محمود شبستری م ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء) اور مطول (تفتازانی م ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء) کا ذکر ان اشعار میں آتا ہے:-

اکسیر کیمیاے سعادت دل من است گوگرد احمرم کہ طلا را کند نحاس

مخزن اسرار معنی اور گوہر بار ماست در درج معرفت لعل لب گفتار ماست

شرح ابروش ز دیباچۂ آن چہرہ ظہیر شاہ بیتی ست کہ از گلشن راز آوردم

شرح مطول سر زلف تو برہم ست پنداشت دل چو رمز لبت مختصر شود

اس ظہیر کا ایک قلمی دیوان اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانے میں ہے جس میں ایک جگہ شاعر نے حافظ شیرازی (م ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء) کا ایک مصرع تضمین کیا ہے:

بگوے دوست ظہیر آنچناں کہ حافظ گفت تبسمے کن و جاں بین چگونہ می سپرم

(۳) دیوان میں شاہ عباس اعظم (م ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۹ء) کے چہار باغ کا ذکر بھی آتا ہے جو اس بادشاہ نے زاینده رود کے قریب ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۸ء میں اصفہان میں تعمیر کرایا تھا۔

ز سیر چار باغ از دیدہ ام زاینده رود آمد صفاہان بر من بیچارہ زندان ست در واقع

(۴) شاعر نے گاو تکیہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو شاید گیارہویں صدی ہجری سے پہلے نہیں تھا۔[1]

رو و ضعیف و مفلس و بے قیمتم ظہیر فارغ چو گاو تکیہ بہ دیوار داده ام

(۵) اب ہم ایک قطعی ثبوت کی طرف آتے ہیں، شاعر نے ایک شعر میں صاف طور پر خود کو صائب اصفہانی (م ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء) کا شاگرد کہا ہے:

بشعر فخر از آں می کند ظہیر کہ سر چو خامہ بر خط تعلیم صائبا دارد

اتفاق سے تہران کا مجموعہ "بہترین اشعار" (تہران ۱۳۱۳ھ ص ۰۶۵) دیکھا

---

[1] مطہر ادرشی (م ۱۰۱۵ھ ؟) کا شعر ہے:-

زبود سے گر از تیرگی پدید نمود شد ست گاو تکیہ ز چرخ کبود

تو اس میں جو اشعار "ظہیر اصفہانی" کے درج ہیں وہ سب کے سب مذکورۃ الصدر مطبوعہ دیوان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس طرح قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ ظہیر اصفہان کا تھا اور وہ یقیناً ظہیر فاریابی سے مختلف ہے، لیکن اس اصفہانی ظہیر کے کوئی حالات کہیں نہیں ملتے، اس کے دیوان سے البتہ چند اشارات جمع کیے جا سکتے ہیں، مثلاً شاعر خود کو ظہیر کے علاوہ ظہیری بھی کہتا ہے:-

اگر پرسند کس حال ظہیری را بگویندش کہ در دام ست آں مرغے کہ شب از آشیاں گم شد

میان خوب رویاں سر بلندی می سزد اورا کہ وار دچوں ظہیری عاشق زار و ناگوئے

صائب کی طرح اس کا شاگرد بھی اہل وطن سے نالاں ہے:-

ہر چند ظہیر از وطن خویش بنالیم بر مادہ سلطان خراسان نتوان[لست]

قدر ارباب سخن را نشناسند ظہیر ایں قدر گنج کہ از سینہ فشاندیم عبث

معلوم ہوتا ہے کہ وہ رزق کی تلاش میں کرمان بھی کبھی گیا تھا،

ما ارادت عشق ز کرمان بریدہ شد زان پس بنام شاہ خراسان نوشتہ اند

حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ (م ۲۰۳ھ/۸۱۸ء) کی مدح میں ایک غزل بھی ہے:

ز دور گوے ثریا یکے فرسیم نوس ز جذبۂ کرم خود مکن مرا مایوس

ایک اور غزل ہے:-

اے صبا گر بخراساں گذری بہر ظہیر ہمتے جز ز دم شاہ غریباں مطلب[1]

ایک اور غزل میں بھی یہی عقیدت ہے:-

---

[1] صائب نے بھی کہا تھا:-

شد الحمد کہ بعد از سفر حج صائب عہد خود تازہ بہ سلطان خراسان کردم

بہ ہر کہ می نگرم تکیہ بر کسے دارد ظہیر دامن آلِ ابو تراب گرفت[1]

لیکن دربارِ صفوی کے تشیع کے باوجود شاعر سنی معلوم ہوتا ہے؛

ظہیر اگر تو بحشر نجات می طلبی زصدق دامن پیغمبر و صحابؓ بگیر

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی دو نعتیہ غزلیں ہیں:۔

کسے کہ می زند از شکوہ فلک تشنیع تمیز عقل نہ دارد چو کودکان رضیع

اے زہلال ناخنت بدر بیک اشارہ شق چرخ نثار مقدمت کردہ ستارہ در طبق

شاعر نے اپنے بڑھاپے کا ذکر بھی متعدد اشعار میں کیا ہے، مثلاً:۔

شد پیر ظہیر و غم او در قدمم ہم درشیب خیالش کہ بماں عہد شباب است

پیری رسید و گشت چناں بے کمالیم گوئی کہ تا جواں کنند از کہنہ سالیم

زبس شکایت علت بداں رسید ظہیر کہ حرفِ صحیح از کلام ما افتد

شاعر کا تعلق تصوف سے بھی رہا ہوگا۔

من پرتوے ز عشقم و بر حسن مائلم مجنون بخد عشقم و لیلی تبائلم

مرد را بر تن لباس معرفت از نیستی ست زن طبیعت میل بر دیبائے زرکش می کند

قناعت اور استغناء کے مضامین بھی بہت جگہ آتے ہیں؛

دنیا طلب مباش و مکن جستجوے گنج قارون بخاک تیرہ شد از آرزوے گنج

یقین او بہ توکل تمام نیست ظہیر کسے کہ وقت سفر فکر زاد راہ کند

درین دو روزہ فانی ظہیر حیرانم کہ بر متاع قلیل جہاں کنند نزاع

---

[1] ظہیر نے عراق (نجف، کربلا وغیرہ) کے لیے بھی آرزو کی تھی:۔

عازم عراق کن کہ دولت وا شود ظہیر کے بے تو راست آبود اندر وطن گرہ

شاعر کوئی اونچے درجے کا تو نہیں ہے، البتہ متاخرین کی بعض خصوصیات اس کے یہاں موجود ہیں، بعض غزلوں میں قوافی مکرر بھی ہیں جو متقدمین کے یہاں بھی تھے، مثلاً

اے زخود بینی بچشمت مردم غم خوار خوار در طریق آزار ما بس گشتہ با اغیار یار

شب بیاد آں بت خندان شگفتم باغ باغ باوجودِ آنکہ از عشق تو گشتم داغ داغ

لعل سیراب تو گرفت از مے گلرنگ رنگ کے روا باشد اگر مطرب نہد از چنگ چنگ

شاعر نے اکثر "ازیں" اور "دریں" (الف کے ساتھ) استعمال کیا ہے۔ مثلاً:

حدیث عشق می سوزد زباں را ظہیر از ایں سخن یک لحظہ خاموش

ظہیر ازایں گدائی لاف شاہی می تواند زد کہ از ترک جہاں ہر روز بر سر افسرے دارم

بہ ہر جا کہ پیدا می کنم اغیار ہم دارد گلے چوں می دمد درایں گلستاں خار ہم دارد

لذتِ خار مغیلاں را چہ می داند ظہیر ہر کہ او درایں بیاباں موزہ در پا می کند

یہ ہیں مختصر حالات جو اس شاعر کے کلام سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

مطبوعاتِ جدیدہ

اسرار و رموز پر ایک نظر ۔ از پروفیسر محمد عثمان ۔ صفحات ۱۸۲، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر اقبال اکیڈمی کراچی،

اقبال کے فلسفہ و شاعری پر ہر سال مختلف زبانوں میں متعدد کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، اور ہر کتاب میں ان کے فلسفہ و شاعری کے کسی نہ کسی گوشہ پر بحث ہوتی ہے، لیکن ان میں بہت کم کتابیں موضوع کا حق ادا کرتی ہیں، زیر تبصرہ کتاب میں اقبال کے فلسفہ و شاعری کے مرکزی نقطہ خودی کی تشریح و توضیح کی گئی ہے اور مصنف نے موضوع کا واقعی حق ادا کر دیا ہے۔

اقبال خواہ کسی موضوع پر قلم اٹھائیں مگر اس کا اختتام خودی ہی پر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے اس نظریہ کو یوں تو اپنی تمام کتابوں میں پیش کیا ہے مگر خاص طور پر اسرار خودی اور رموز بیخودی میں انھوں نے خودی کے فلسفہ کو بڑی وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا ہے، مگر اقبال محض شاعر نہ تھے بلکہ فلسفی اور مفکر بھی تھے، اور ایک روحانی نظام حیات یعنی اسلام کے قائل بلکہ مبلغ بھی تھے، اس لیے انھوں نے جو کچھ کہا ہے اسے عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں کہا ہے، اس وجہ سے ان کے نظریہ خودی کی توجیہ مختلف لوگوں نے مختلف انداز میں کی ہے، اور زیادہ تر لوگ فکر اقبال کو دور بہت گئے ہیں، پروفیسر عثمان صاحب قابل ستایش ہیں کہ انھوں نے اقبال کے دل و دماغ اور فکر و فلسفہ کو اچھی طرح سمجھ کر پھر اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، کتاب میں کل ۱۷ ابواب ہیں اور تمام باب پڑھنے کے لائق ہیں اس کتاب سے اقبالیات میں ایک عمدہ اضافہ ہوا ہے۔

اردو غزل ولی تک ۔ از ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی صفحات ۲۰۰، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر بزم اشاعت اسماعیل کالج جوگیشوری بمبئی ۲۱

اردو میں غزل گوئی کی ابتدا ولی سے بہت پہلے ہو گئی تھی، مگر اس میں نوک و پلک ولی ہی نے پیدا کی اور انہی کے ذریعہ شمالی ہند میں اردو شاعری اور خاص طور پر غزل گوئی کا عام رواج ہوا، انھوں نے نہ صرف اردو شاعری کو نکھارا و سنوارا بلکہ اردو زبان کو نئے نئے محاوروں، تشبیہوں اور ترکیبوں سے روشناس بھی کیا، البتہ ایہام گوئی کو اردو شاعری میں وہ ایسا رواج دے گئے کہ ایک صدی کے بعد مرزا مظہر جان جاناںؒ اور خواجہ میر دردؒ اور ان کے معاصرین کے ذریعہ جا کر اس سے اس اردو شاعری کی گلو خلاصی ہوئی،

زیر تبصرہ کتاب میں ولی تک کی غزل گوئی پر مختصر طور پر تبصرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر ولی کے کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے، گویہ کتاب دو ابتدائی صوبوں کی غزل گوئی کی تاریخ ہے، کتاب محنت و جستجو سے لکھی گئی ہے، اس کے مطالعہ سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

افاداتِ ابن عربیؒ ۔ از شیخ محب اللہ الٰہ آبادی، مترجم شاہ غلام مصطفیٰ مرزا و شاہ محمد باقر الٰہ آبادی، صفحات ۲۴۰ کتابت و طباعت بہتر، ناشر ادارہ انیس اردو الٰہ آباد

شیخ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم ہر زمانہ میں مقبول و معروف رہی، یہی وجہ ہے کہ متعدد اکابر علما نے اس کی دو درجن سے زیادہ شرحیں لکھیں، خود ہندوستان میں اس کی ۱۲-۱۳ شرحیں لکھی گئی ہیں جن میں دو شرحیں شیخ وقت حضرت محب اللہ الٰہ آبادیؒ کے پُر حکمت قلم سے ہیں، شیخ محب اللہؒ شیخ اکبر کے بڑے دلدادہ اور ان کے علوم و معارف کے بہترین شارح تھے، انھوں نے دو شرحیں ایک عربی اور ایک فارسی میں لکھی تھیں، پیش نظر کتاب اس فارسی شرح کا ترجمہ ہے، مضامین کی پیچیدگی کے باوجود ترجمہ اچھا ہے، البتہ متن اور ترجمہ کی عبارت کو ساتھ ساتھ نہیں رکھا گیا ہے،

اس لیے بیچ سے کسی بحث کو مطالعہ کرنے میں دقت ہوتی ہے،

شہر آرزو۔ از باقر مہدی، صفحات ۱۹۲، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر خلیل احمد خاں، گوشۂ ادب ۲/۲۱ وکٹوریا بلڈنگ، بمبئی ۸، قیمت: ۔/۳

باقر مہدی کی شاعری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے، مگر ان کا دیوان دو بار چھپ چکا ہے جس سے ان کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، رباعی، نظم اور غزل تینوں اصناف میں باقر مہدی نے طبع آزمائی کی ہے، اور ہر ایک میں کامیاب ہیں، البتہ ترقی پسندی کے چرکے نے ان کے حسن بیان اور لطف زبان دونوں کو قدرے نقصان پہنچایا ہے، کاش وہ اس دام ہمرنگ زمین کے فریب سے بالکل بچ جاتے تو انکی شاعری کا حسن دوبالا ہو جاتا،

غالب کی نادر تحریریں۔ از خلیق انجم، صفحات ۱۰۴، کتابت و طباعت متوسط، ناشر مکتبہ شاہراہ، دہلی، قیمت :- للعہ

جن شعراء و ادباء کے ذاتی خطوط کو ادبی حیثیت سے بہت زیادہ قابل اعتناء اور معیاری سمجھا گیا، ان میں غالب و شبلی کا نام سرفہرست ہے، غالب کے خطوط کے ابتک کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، زیر تبصرہ کتاب ان کے سوسے زیادہ نادر خطوط کا مجموعہ ہے، اس میں ان کی بعض اور نادر تحریریں بھی خلیق انجم صاحب نے جمع کر دی ہیں، اس کی اشاعت سے غالب کی نثریات میں ایک نیا اضافہ ہوا ہے۔

اقبال کے آخری دو سال۔ از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، صفحات ۶۸۰، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر اقبال اکیڈمی، کراچی، قیمت :- لعہ

اقبال اکیڈمی نے ادھر چند برسوں میں جو متعدد اچھی کتابیں شائع کی ہیں، ان میں ایک کتاب یہ بھی ہے، علامہ اقبال کی عمر کے آخری دو سالوں میں ہندوستان کے سیاسی حالات کیا رہے اور علامہ اقبال نے اس میں کیا حصہ لیا، اس کتاب کا اصل موضوع یہی ہے، مگر اس کے ضمن میں اور بہت سی مفید باتوں کا ذکر آگیا ہے۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں سنہ ۱۹۳۶ء اور سنہ ۱۹۳۸ء کا درمیانی زمانہ بہت ہی اہمیت رکھتا ہے، ان دو سالوں میں سیاسی لیڈروں نے ہندوستانی باشندوں کے دل و دماغ میں جو باتیں اتاریں انہی کے مطابق چھ سات سال کے بعد ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا، ان دو سالوں میں علامہ اقبال کے جذبۂ حریت اور نظریۂ سیاست میں جو عملی تبدیلیاں ہوئیں یا جن کا علامہ اقبال کو سابقہ پڑا ان سب کو عاشق حسین صاحب نے بڑے سلیقے سے جمع کر دیا ہے، کتاب کے تمام مندرجات سے اتفاق کرنا مشکل ہے، تاہم یہ ایک مفید کام ہو گیا ہے۔

معارف المشکوٰۃ۔ از مولانا سید عبد الرؤف صاحب عالی، صفحات ۱۰۰، تقطیع کلاں، ناشر: اشاعت منزل، دیوبند۔

مشکوٰۃ المصابیح حدیث نبویؐ کا بہترین ذخیرہ ہے، اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ چھ صدی سے برابر عربی نصاب تعلیم کا جزو رہی ہے، ہندوستان میں جب صحاح ستہ کا رواج نہیں ہوا تھا، مشارق الانوار اور مشکوٰۃ ہی عام طور پر مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں، مشکوٰۃ کی بے شمار شرحیں اور حواشی لکھے گئے، خود ہندوستان میں عربی و فارسی اور اردو میں متعدد شرحیں لکھی گئیں، انہی میں ایک مظاہر حق بھی ہے، جو آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے اردو زبان میں لکھی گئی، خانوادۂ ولی اللّٰہی کے آخری چشم و چراغ شاہ محمد اسحاقؒ نے مشکوٰۃ کا ایک سادہ اور عمدہ ترجمہ کیا تھا، انہی کے مشورہ سے مولانا قطب الدین خاں دہلوی نے اس ترجمہ کو مظاہر حق کے نام سے ایک مستقل شرح کی حیثیت دیدی، چونکہ یہ کتاب ڈیڑھ سو برس پہلے کی تصنیف ہے، اس لیے اس زمانہ کے لوگوں کے لیے اس سے استفادہ کرنا دشوار تھا، اسی

دشواری کو حل کرنے کے لیے مولانا سید عبدالرؤف صاحب نے اس کی زبان و بیان میں تسہیل کرکے اسے دوبارہ شائع کیا ہے، شروع کتاب میں ایک مبسوط اور قیمتی مقدمہ بھی ہے، دینی حیثیت کے ساتھ اس کتاب کی ایک ادبی اہمیت بھی ہے، یعنی اس کا شمار بھی اردو کی ان کتابوں میں ہوتا ہے جن کے ذریعہ اردو زبان کی آواز گھر گھر پہنچی۔

شہرِ دل۔ از محسن زیدی، صفحات ۱۳۶، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر مرکز ادب نیا محلہ پل بنگش، دہلی ۶، قیمت :- عہ

محسن زیدی ایک نوجوان شاعر ہیں، اور ان کی شاعری کی عمر بھی مختصر ہے، اسکے باوجود انکی غزلوں میں بڑی مشاقی پائی جاتی ہے، اور تمام ہی غزلوں کی زبان نہایت پاکیزہ اور ستھری ہے، تخیل میں بھی عمر کے لحاظ سے کافی وسعت اور گہرائی نمایاں ہے، ان کے کلام میں ایک طرح کی انفرادیت جھلکتی ہے، اگر چشمِ فلک سے یہ محفوظ رہ گئے اور دوستوں نے انھیں اپنا نشانہ نہ بنایا تو یہ ایک دن اچھے شاعر کی حیثیت سے ملک میں معروف ہوں گے۔

دیوان ہاشمی۔ مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل ایم اے، پی ایچ ڈی، صفحات ۳۶۲، کتابت و طباعت معمولی، ناشر ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد۔ قیمت سے

ہاشمی بیجاپوری متوفی ۱۱۰۹ھ دکن کے پہلے صاحب دیوان ریختی گو شاعر ہیں، اپنی شاعرانہ صلاحیت کی بنا پر عادل شاہی دربار تک پہنچے اور ان کی وہاں بڑی عزت افزائی ہوئی، اب تک اس قدیم شاعر کے کلام کی طرف خاص توجہ نہیں کی گئی تھی، ادارۂ ادبیات اردو اور ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب صدر شعبۂ اردو عثمانیہ قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ہاشمی کے کلام سے اردو داں طبقہ کو روشناس کیا، دیوان کے شروع میں مرتب کا ایک مقدمہ ہے جس میں انھوں نے ہاشمی کے حالات اور خصوصیاتِ کلام پر روشنی ڈالی ہے۔

"م - ج"

جلد ۸۹۔ ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۶۲ء۔ عدد ۵

مضامین